شاہکار

ا
روپیہ

حسنِ ترتیب

مضمون

غزلیں

ممتاز الحق پرنٹر پبلشر نے اسرار کریمی پریس الہ آباد میں چھپوا کر دفتر "شاہکار"

ممتاز باغ، لوکر گنج، الہ آباد سے شایع کیا

اچھی تحریروں کا انتخاب



سید احتشام حسین
خواجہ احمد عباس
مہندر ناتھ
خلیل الرحمن اعظمی
جیلانی بانو













شاہکار

دفتر شاہکار، ممتاز باغ، لوکر گنج، الہ آباد ۲

خطاط ریاض احمد انصاری



کہانیاں

نظمیں

مضمون

غزلیں

ممتاز الحق پرنٹر پبلشر نے اسرار کریمی پریس الہ آباد میں چھپوا کر دفتر "شاہکار" ممتاز باغ، لوکر گنج، الہ آباد سے شایع کیا

ہمیں کچھ کہنا ہے

گذشتہ چند مہینوں میں ہمیں جن انتظامی مشکلات سے گزرنا پڑا اس میں ہم نے آپ کو شریک نہیں کیا کیونکہ اس کا تعلق محض رسالے کی مالی مشکلات سے نہ تھا بلکہ ایسی تبدیلیاں درپیش تھیں جن میں ہم آپ سے مدد کے طلبگار بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ خدا خدا کر کے اب راستے سے بعض رکاوٹیں ہٹ گئیں ہیں اور ہمیں صرف یہ فکر ہے کہ رسالہ ہر ماہ وقت پر شایع ہو اور اس کے دامن میں ایسے پھول ہوں جن کی خوشبو آپ کو واقعی پسند آئے۔ اس دفعہ جو آپ کو چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں نظر آئیں انھیں اس مقصد کی تکمیل کا آغاز سمجھئے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہماری قومی معیشت کس دور سے گزر رہی ہے۔ کاغذ، کتابت، طباعت ہر چیز اس سے متاثر ہے، لیکن ہم نے ارادہ کیا ہے کہ ہم رسالہ کی قیمت بڑھانے کے بجائے فی الحال اپنے پڑھنے والوں سے صرف یہ درخواست کریں کہ وہ شاہکار کی توسیع اشاعت میں ہمارا ہاتھ بٹائیں، ممکن ہو تو اپنے اپنے حلقۂ اثر میں اس کے مستقل خریدار بنائیں۔ ہو سکے تو اس کے لیے ایسے اشتہارات فراہم کریں جو رسالہ کے شایانِ شان ہوں اور ہمیں کبھی کبھی اپنے مشوروں اور اپنی تعمیری تنقیدوں سے نوازتے رہیں۔

ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہماری طرف سے اس وقت تک کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہوگی جب تک کہ ہم بالکل مجبور نہ ہو جائیں۔

ادارہ



ہمیں کچھ کہنا ہے

گذشتہ چند مہینوں میں ہمیں جن انتظامی مشکلات سے گزرنا پڑا اس میں ہم نے آپ کو شریک نہیں کیا کیونکہ اس کا تعلق محض رسالے کی مالی مشکلات سے نہ تھا بلکہ ایسی تبدیلیاں درپیش تھیں جن میں ہم آپ سے مدد کے طلبگار بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ خدا خدا کر کے اب راستے سے بعض رکاوٹیں ہٹ گئیں ہیں اور ہمیں صرف یہ فکر ہے کہ رسالہ ہر ماہ وقت پر شایع ہو اور اس کے دامن میں ایسے پھول ہوں جن کی خوشبو آپ کو واقعی پسند آئے۔ اس دفعہ جو آپ کو چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں نظر آئیں انھیں اس مقصد کی تکمیل کا آغاز سمجھئے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہماری قومی معیشت کس دور سے گزر رہی ہے۔ کاغذ، کتابت، طباعت ہر چیز اس سے متاثر ہے، لیکن ہم نے ارادہ کیا ہے کہ ہم رسالہ کی قیمت بڑھانے کے بجائے فی الحال اپنے پڑھنے والوں سے صرف یہ درخواست کریں کہ وہ شاہکار کی توسیع اشاعت میں ہمارا ہاتھ بٹائیں، ممکن ہو تو اپنے اپنے حلقہ اثر میں اس کے مستقل خریدار بنائیں۔ ہو سکے تو اس کے لیے ایسے اشتہارات فراہم کریں جو رسالہ کے شایانِ شان ہوں اور ہمیں کبھی کبھی اپنے مشوروں اور اپنی تعمیری تنقیدوں سے نوازتے رہیں۔

ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں [illegible] ی طرف سے اس وقت تک کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہو گی جب تک کہ ہم بالکل مجبور نہ ہو ج[illegible]

ادارہ

کرشن چندر

دیوتا اور کسان

یہ اس زمانے کی بات ہے جب دیوتا ہم انسانوں ہی میں رہتے تھے، بولتے چالتے اور کھاتے پیتے تھے اور مصیبت کے وقت لوگوں کو صحیح مشورہ اور نیک صلاح دیتے تھے۔ لوگوں میں ان کی بڑی عزت تھی اور وہ اپنی عقل اور فرزانگی کی وجہ سے پوجے جاتے تھے۔ لوگ اپنی ہر تکلیف ان کے پاس لے جاتے تھے۔ کیونکہ اس زمانے میں دیوتا انسانوں سے دور نہ تھے۔

اس زمانے میں چک ڈھوڈھا کلاں نمبر ۲۱۸ ضلع ہوشیارپور میں ایک پیپل کے پیڑ کے نیچے ایک دیوتا رہتا تھا۔ اس کا نام گج گج تھا۔ وہ اپنے جسم پر راکھ کی بجائے سیندور کی بھبھوت رماتا تھا۔ اس دیوتا کے جسم کا لال لال رنگ دور دور تک لوگوں کو نظر آتا تھا۔ لوگ اپنی کڑی مصیبت کے وقت اس کے پاس دوڑے جاتے۔ سیس نواتے، پھول بتاشے چڑھاتے اور اس سے بردان پاتے۔ آس پاس کے علاقے میں اور بھی دیوتا تھے لیکن ان سب سے زیادہ گج گج ہی مشہور تھا اور لوگ سب سے زیادہ اسی کے پاس جاتے تھے۔

اسی زمانے میں چک ڈھوڈھاں کلاں نمبر ۲۱۸ ضلع ہوشیارپور میں ایک غریب کسان رہتا تھا۔ وہ [illegible] دولت کے اعتبار ہی سے غریب نہ تھا، مزاج کا بھی بے حد غریب تھا۔ ہمیشہ سر جھکا کے چلتا۔ عاجزی سے بات کرتا اور اپنے بڑوں کا ادب کرتا۔ آج تک کسی نے اس کے منہ سے ایک گالی نہ سنی تھی۔ گاؤں میں اس کی زمین سب سے کم تھی اور بیلوں کی ایک ہی جوڑی اس کے پاس تھی اور اس کا چھپر سب سے چھوٹا تھا۔ پھر بھی کسی نے شکر کے سوا اس کے منہ سے کچھ اور نہ سنا۔ وہ بڑا محنتی اور نیک دل کسان تھا اور اپنی چھوٹی سی کھیتی باڑی، اپنے چھوٹے سے گھر اور پیاری بیوی

اور بچوں میں مگن تھا۔ گُج گُج دیوتا اس سے بہت خوش تھا اور لوگوں کو سمجھاتے وقت اکثر اس کی مثال دیا کرتا تھا۔

پھر وہ غریب کسان ایک تپتی دوپہر میں پریشان حال گھبرایا ہوا دیوتا کے قدموں میں حاضر ہوا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔

"مہاراج مجھ پر بڑا ظلم ہوا ہے۔ ایک بڑا ٹڈی دل آیا اور میرے کھیتوں پر بیٹھ گیا۔ وہ ٹڈی دل کسی دوسرے کسان کے کھیت پر نہیں بیٹھا۔ صرف میرے کھیتوں میں بیٹھا اور میری ساری ہری بھری فصل اجاڑ گیا اور پھر اُڑ کر چلا گیا۔ مہاراج میں تو لٹ گیا، اجڑ گیا، برباد ہو گیا۔ اب میں اور میرے بیوی بچے کہاں سے کھائیں گے؟"

دیوتا گُج گُج نے کسان کی فریاد سن کر اپنی آنکھ کھولی اور کہا۔

"جب ٹڈی دل فصل کھا کر اڑا جا رہا تھا کیا تو نے اس وقت آسمان کے بادلوں کو دیکھا تھا جو اپنے سینے میں نئی فصل کا سندیش لے کر آتے ہیں؟"

کسان لاجواب ہو گیا۔

اور دیوتا کے پیر چھو کر چلا گیا۔

ایک سال بعد کسان پھر اپنے بال نوچتا ہوا دیوتا کے سامنے آکھڑا ہوا اور دل شکستہ لہجہ میں بولا۔

"گُج گُج دیوتا! ندی میں باڑھ آگئی۔ کسی کا چھپر ٹوٹا کسی کا بیل ڈوب گیا۔ لیکن میرے تو تینوں کھیتوں کو بہا کر لے گئی۔ مہاراج میرے پاس دھان کے دہی تین کھیت تھے جنھیں باڑھ بہا کر لے گئی۔ اب میرے بچے چاول کے ایک ایک دانے کو ترسیں گے۔"

دیوتا بولے۔

"جو چاول کے لیے دھان نہیں اگا سکتے وہ مکا، جوار اور گیہوں اگاتے ہیں اور اسی سے اپنا پیٹ بھر کے شکر کرتے ہیں۔"

دیوتا کی بات سن کر کسان خاموش ہو گیا اور واپس چلا گیا۔

دو سال بعد کسان کے دونوں بچے ہیضے میں مر گئے۔ ایک لڑکا تھا ایک لڑکی تھی۔ وہ انکی

لاشیں اپنے سینے سے لگائے زار و قطار روتا ہوا دیوتا کے چرنوں میں آیا اور گڑگڑا کر کہنے لگا۔

"میرے دونوں بچے مر گئے! میرے دونوں بچے مر گئے! بھگوان کے لیے انہیں زندہ کر دو۔"

گُج گُج دیوتا نے کہا "جو مر جاتے ہیں وہ کبھی زندہ نہیں ہوتے۔ موت سب کے لیے ہے۔ اسی لیے موت کے غم کو سب بھول جاتے ہیں۔"

"ہائے میں لاوارث ہو گیا گُج گُج دیوتا" کسان روتے ہوئے بولا "میرے دونوں بچے مر گئے۔"

گُج گُج دیوتا نے کڑی نظروں سے کسان کی طرف دیکھا اور بولے۔

"بھری برسات میں تو بنجر سے بنجر زمین پر بھی پھول کھلتے ہیں۔ اور تیری بیوی تو جوان ہے، خوبصورت ہے، کوکھ والی ہے۔"

دیوتا کے جواب نے کسان کو چپ کرا دیا۔ اس کے دل کی تسلی نہ ہوتی تھی۔ لیکن وہ اپنے بچوں کی لاشیں سینے سے لگائے واپس چلا گیا۔

لیکن چھ ہی مہینوں کے بعد پھر آیا

اور آتے ہی دیوتا کے قدموں میں لپٹ گیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

"کیا ہے؟"

دیوتا نے اس سے پوچھا۔

"میری بیوی!" کسان اپنے آنسوؤں سے تر بتر رخسار دیوتا کے قدموں سے ملتے ہوئے بولا "میری بیوی بھی مر گئی۔ پہلے میری فصل گئی۔ پھر کھیت گئے۔ پھر میرے بچے گئے اور آج میری بیوی بھی چل بسی۔ میری زندگی کا آخری سہارا۔ ہے دیوتا اب میں کیا کروں؟"

دیوتا دیر تک چپ رہے۔

ان کے پرانے خاموش چہرے پر غور و فکر کی لکیریں ابھر آئیں۔ پھر ہوتے ہوتے ان کے چہرے پر ایک انوکھی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ بڑے نرم، سنجیدہ اور ہمدردی بھرے لہجے میں بولے۔

"جب تو اپنی بیوی کی چتا جلا کر آ رہا تھا تو کیا تو نے گھاٹ کے کنارے جوہی کے

پھول دیکھے تھے ؟"

"ہاں دیکھے تھے !" کسان نے جواب دیا: "لیکن جوہی کے پھولوں کا میری بیوی سے کیا واسطہ؟"

دیوتا نے اسے سمجھایا "جہاں چتا جلتی ہے وہاں جوہی کے پھول بھی ہوتے ہیں !"

کسان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ اپنی بیوی کی موت سے دیوانہ ہو رہا تھا......

اس نے پوری طاقت سے اپنے دیوتا کے پیر پکڑ لیے اور غم و غصے سے بے تاب ہو کر وحشت ناک آواز

میں بولا۔

"مگر مہاراج! وہ میری بیوی تھی بیوی! میرے دل کا آخری سہارا۔ آج وہ سہارا بھی

جاتا رہا۔ دیوتا!"

دیوتا نے جواب میں پھر کہا۔

"اور جب تو چتا جلا کر واپس اپنے گھر جا رہا تھا تو کیا تو نے راستے میں گاؤں

کے کنوئیں پر کنواریوں کو پانی بھرتے نہیں دیکھا۔ ان کی آنکھوں کا لہجہ، ان کی میٹھی باتوں کی خوشبو

ان کے خدوخال کی روپہلی گونج کیا تجھے یاد نہیں؟"

دیوتا چپ ہو گئے۔

کسان نے دیر تک دیوتا کے چہرے کی طرف دیکھا۔ لیکن جب دیوتا کے منہ سے کچھ اور

نہ نکلا تو وہ دیوانہ وار دیوتا کے قدموں سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے لپک کر دیوتا کو گردن

سے پکڑ لیا اور اس کا سر زور سے پیپل کے پیڑ سے ٹکرا دیا۔

دیوتا کے ماتھے سے خون کی دھار پھوٹ نکلی۔

اور وہ خوف سے چلایا۔

"ہائے میرا سر پھٹ گیا۔"

کسان نے کہا۔

"سر پھٹ گیا تو کیا ہوا وہ دیکھو آسمان پر ابابیلیں اڑی جا رہی ہیں۔"

اور یہ کہہ کر کسان نے گُجّ گُجّ دیوتا کے جبڑے پر دو گھونسے مارے!

"ہائے میرے دانت ٹوٹ گئے!"

گُجّ گُجّ دیوتا درد سے بے تاب ہو کر چلایا۔

"دانت ٹوٹ گئے تو کیا ہوا؟" کسان دانت پیس کر بولا "وہ دیکھو پیپل کے پرے تالاب کے کنارے کیسے سندر پھول کھلے ہیں"

اور یہ کہہ کر کسان نے گُجّ گُجّ دیوتا کا بازو موڑ کر اسے کسی درخت کی شاخ کی طرح توڑ دیا۔

دیوتا چیخ کر بولا۔

"ہائے میرا بازو بھی ٹوٹ گیا۔"

"بازو ٹوٹ گیا تو کیا ہوا؟" کسان غیظ و غضب میں جھلا کر بولا "شکر کرو کہ تم اندھے نہیں ہو"

اور پھر۔

اس دن سے بھگوان نے طے کیا ـــــ کہ سب دیوتا پتھر کے ہوں گے اور منہ سے کچھ نہیں بولیں گے۔

عصمت چغتائی

عشق پر زور نہیں

"اے آپا، کچھ سنڈا!" دہاب چچا کی دلہن کی ناک کے غدود پھول گئے تھے ہیں نے ان کی ناک سے خون نکلتے نہیں سنا۔ وہ بھد بھد کرتی بڑے ابا والی ڈیوڑھی سے اتریں۔ ان کی گود میں ان کا دسواں بارہواں اسقاط تھا۔ ننھے بھائی ان کے ہر بچے کو اسقاط کہا کرتے تھے کیونکہ جونہی ان کا پیر بھاری ہوتا وہ اسقاط کے لئے ہاتھ پیر مارنا شروع کر دیتیں۔ دور دور کے محلوں کی دائیاں اور مہترانیاں ہار جائیں اور ٹلوا ہیاؤں ہیاؤں آہی جاتا مشکل سے ساڑھے چار فٹ کا قد ہوگا مگر قطر بھی اتنا ہی ہوگا بس گوں جیسے ہوا بھری فٹ بال۔ پیٹ خالی ہوتا جو کہ بہت ہی تھوڑے دنوں کے لئے ہوا کرتا تھا تب بھی وہی حالت رہتی۔ انچ دو انچ کا فرق تو وہ جب ڈٹ کر رجب کے کونڈے کھاتی تھیں جب بھی ہو جاتا تھا۔ سیپر کھسلتی وہ دھپ سے آکر بیوی کے پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ بیوی اور ان کی پٹاری پھنک اٹھے ہم اپنی ماں کو نوکروں کی دیکھا دیکھی بیوی ہی کہتے تھے۔

اے ہے موت آلے، دگوڑے نے بوت دیا۔ وہ لونڈے کو پائینتی پہ لٹکا کر "شی شی" کرنے لگیں۔

بیوی جل گئیں "کمبخت نے موت دیا تو اس میں کوسنے کی کونسی بات ہے؟"

"اے ڈینی میں تو اس کا ذکر کر رہی تھی آپا، خلیفہ ڈڈے ٹو کاح کر لیا۔"

"اوئی۔ خلیفن نے نکاح کر لیا۔ کب؟۔ کس سے؟" بیوی ناک پہ سروتا رکھ کر چونکیں۔

"پچھلی جمیرات۔ ممد میاں سے۔"

"اے خدائی خوار کو یہ بڑھاپے میں کیا چونچلے بگھارنے کی سوجھی۔"

"اللہ جانے۔" چچا دہاب کی دلہن نے گریبان کھول کر لونڈے کا دسترخوان لگا دیا۔ اللہ،

کیا بدن تھا۔ ہم لونڈیاں بالیاں تو شرم سے پانی پانی ہو جایا کرتی تھیں۔ بچوں کے ناشتہ دان تھے کہ مرادآبادی لوٹے۔ پچھلا اسقاط تو اسی لوٹے کے نیچے دب کر جاں بحق تسلیم ہو گیا۔ رات کو سوتے میں منہ میں دودھ دیا۔ نہ جانے کیسے نیند میں کروٹ لی کہ منہ اور ناک پر ڈھائی تین سیر گوشت آن پڑا بیچارے کا دم گھٹ گیا۔ مرگیا۔ ان کا جسم دیکھ کر مجھے خیال آیا کرتا تھا کہ شاعروں کو عورت کے اس حصۂ جسم سے بڑا عشق ہے دیکھ لیں ایک دفعہ وہاب چچا کی دلہن کو تو جی بھر جائے۔

خلیفن پینتالیس سال کے پیٹے میں ہو گی۔ خلیفہ کو مرے چار پانچ سال ہو چکے تھے۔ شریف عورت اس عمر میں بوڑھی ہو جاتی ہے اور کسی سے دل لگانے کی بجائے خدا سے لَو لگاتی ہے۔ کوئی انگوڑی نا ہیٹی نہ تھیں۔ دو بیٹے دو بیٹیاں۔ چھوٹی بیٹی بگو میرے ساتھ دھن کوٹ کے مدرسے میں روز تختیوں سے پیٹی جاتی تھی۔ باقری کا رحمٰن بھائی کے لونڈے انو سے بڑے دھماکے کا عشق کا چل رہا تھا کیوں کہ ڈلا کا کردار خاکساری ادا کرتی تھی۔

خلیفن کا سن نکاح کا نہ تھا۔ پھر محمد میاں ان سے دو سال چھوٹے ہی ہوں گے۔ بیوی ڈیڑھ سال ہوا چار بچے چھوڑ کر مر گئی تھی۔ نگوڑے ناٹھے رہ گئے تھے کیا دیو ہیکل انسان تھے! یہ لمبا قد، چوڑی چھاتی، چیچک رو، سیاہ بھجنگے۔ لکڑی کا دھندا کرتے تھے۔ چھتے پر ان کی ٹال تھی۔ خود ماٹھان میں رہتے تھے۔ کبھی لکڑی کی ضرورت ہوتی تو خود جھگڑا لے کر آتے تو ڈیوڑھی پر ضرور آتے۔

"آپا نچھو۔ پان دان نہیں دو گی" وہ زور سے ڈنکارتے۔ محلوں ٹولوں میں سب رشتہ دار ہی ہوتے ہیں۔ اماں جنھیں محمد میاں کی ہاتھی جیسی چنگھاڑ سے دل کا دورہ پڑنے لگتا تھا۔ جلدی سے پان لگا پاندان کے ڈھکنے پر رکھ کر بھجوا دیتیں۔ محمد بھائی خاصدان میں پان لگا کر جانے والی حیثیت کے آدمی نہ تھے ان کی بیوی زندہ تھیں آتیں تو پلنگ کی ادوائن پر ہی بیٹھتیں۔ وہاب چچا کی دلہن دھپ سے ہر جگہ بیٹھنے کا حق رکھتی تھیں۔

علیم الدین، کلیم الدین دو بیٹے ریلوے میں گڈس کلرک تھے۔ بڑی بیٹی زینب ہمارے ہی محلے میں یعنی پنجہ شاہی میں رہتی تھی۔ ان کے میاں کندے کا کام کرتے تھے۔ چھوٹی کا میاں فیض آباد میں تھانیدار تھا۔ وہ سب سے زیادہ مالدار تھا۔ خلیفہ نے انھیں کسی کا محتاج نہیں چھوڑا تھا۔ اپنا مکان

تھا۔ دو کوٹھریاں اور کھپریل، گھر بیٹھے بٹھائے نیک بخت کو کیا مار پڑی کہ جوان جہان بیٹیوں، بیٹوں کا منہ کالا کرادیا۔

زینب خالہ نے تو رو رو کر آنکھیں سجالیں۔ ان کی نندوں نے اتنے طعنے دیئے کہ کلیجہ چھلنی کر دیا۔ انھوں نے جل کر پھندن کی منگنی اپنی بڑی نند کی لونڈیا سے توڑ دی۔ پھندن اپنی پھوپھی زاد بہن سے بچپن سے منگا ہوا تھا۔

پھندن کی منگنی ٹوٹ گئی۔ پھندن کی دلہن روٹھ گئی۔ پھندن کی ساس نے منگنی توڑ دی۔ گلی کے لونڈوں نے وہ لنگوٹے کے پیچھے تالی دی کہ اس نے اسکول جانا چھوڑ دیا۔ دن بھر کنکیاں لوٹا کرتا تھا۔ چھ برس کا پھندن مجنوں بن گیا۔

ڈھیلی ڈھالی خلیفن سے کسی کو امید نہ تھی کہ یوں بڑھاپے میں خصم کر لیں گی۔ موا سارا جوڑا بھسک ہوتا جا رہا تھا۔ ہاں بتیسی سلامت تھی سفید براق کپڑے پہن کر کبھی تیج تیوہار پر حصے کی رکابی تھامے ہمارے ہاں آتی تھیں۔ اکیلی اپنے گھر میں رہتی تھیں۔ بڑی محبت کی آدمی تھیں۔ بات بے بات بچوں کو گھر میں بھرے رہتی تھیں۔ کبھی سنگھاڑے بانٹ رہی ہیں، کبھی بیر۔ کبھی کچھ نہیں تو مٹھی مٹھی چنے ہی بانٹے دیتیں۔ باری باری سب بیٹوں بیٹیوں کے ہاں جاکر رہیں۔ مگر کسی کو ان کی ضرورت نہیں تھی ویسے زبان کی ہمیشہ سے کڑوی تھیں پر خلیفہ کی موت نے تو زبان کی نوک پر زہر بھر دیا۔ جہاں جاتیں سبھی کا کانٹا بن جاتیں۔ میاں بیوی میں طلاقم طلاقا پر نوبت پہنچ جاتی۔ ویسے زینب آپا کی سسرال میں اتنی جگہ بھی نہ تھی کہ خلیفن بھی رہ سکتیں۔ کلیم الدین کی بیوی سے اس لئے نہ بنی کہ وہ ٹھہریں فیشن ایبل۔ ان کی بچیاں گپے سے بالوں میں ربن ڈالتیں۔ خلیفن کو ہول اٹھتا۔ وہ تیل چپڑ کر مینڈیاں باندھ دیتیں۔ بہو نے صاف کہہ دیا "یا تو اماں رہیں یا میں" ظاہر ہے کہ اماں کو بوریے بستر اٹھا کر اپنے گھر لوٹنا پڑا۔ فیض آباد دہلی کے ہاں جی نہ لگا۔ گھر نوکروں کے ہاتھ میں تھا۔ یہ ذرا ذرا سی بات پر چوریاں پکڑتیں، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہتیں۔ لازم تو یہ تھا کہ مزے سے دو وقت کی روٹی ملتی تھی۔ اللہ کی یاد میں وقت گزارتیں۔ مگر نہیں خلیفن کو تو کُھجل تھی نچلا بیٹھنا دشوار تھا۔ گھسر پھسر سارے گھر میں گھستی پھرتیں۔ ادھر کی چیزیں اُدھر، ہر جگہ گھر میں تالے۔ نوکروں نے ان کے خلاف

محاذ بنالیا۔ زندگی دشوار ہوگئی۔ ویسے میاں بیوی کو اپنی باتوں سے کب فرصت ملتی تھی جو ان سے دو باتیں کر لیتے۔ نہ گھر میں بچہ تھا کہ ان کا جی بہلتا۔ چھوٹے نے صاف انکار کر دیا۔ یہاں آپ کو قباحت ہوگی۔ میں خرچہ تو بھیج رہا ہوں پابندی سے۔ خرچے کی خلیفن کو کمی نہ تھی۔ صرف خرچہ ہی زندگی کے لئے کافی نہیں تھا انھیں سجی ہوئی مورتی کی طرح بیٹھنے کی عادت نہ تھی۔ اچھے خاصے گھر میں کون تھا کوڑا کرنے والا پھر بھی جھاڑ دیتیں۔ خلیفہ زندہ تھے تب اتنی تنہائی نہ تھی۔ کتنے کام تھے۔ کیسا بھرا بھرا گھر لگتا تھا۔ ایک دم کی کتنی رونق تھی۔ چھوٹے کی جب تک شادی نہ ہوئی تھی زینت بھی باپ کی لاڈلی تھی۔ کیا مجال جو روز نہ آئے۔ اب مہینے گزر جاتے تھے اسے اپنے بال بچوں سے فرصت نہ تھی کبھی وہ دن تھے کہ خلیفن کو نواسوں، پوتوں کی طرف نظر اٹھانے کی فرصت نہ تھی خلیفہ ہی ان کی گود کا بچہ تھے۔

کئی سال سے چلنے پھرنے سے معذور تھے خلیفن انھیں نرسوں سے زیادہ بنا سنوار کر رکھتیں، کرتے کاڑھ کاڑھ کر پہناتیں۔ ان کے گھٹنے پر مالش کرتیں۔ حقہ دم دم بھر کر دیتیں۔ پچیس سال کا ساتھ تھا۔ خلیفہ ان کے جسم کا حصہ بن چکے تھے۔ ان کے پیار میں کتنا انہماک تھا کہ عبادت کا شبہہ ہوتا تھا۔ وہ ایک پل کو اوجھل ہو جائیں تو خلیفہ بچوں کی طرح مچل اٹھتے مرتے گئے کبھی پٹی سے بیوی کی پلنگڑی جدا نہ کی۔

رات کو خلیفہ ان سے فلرٹ کرتے تو وہ نئی نویلی دلہن کی طرح تنک کر کہتیں۔

"اے ہٹو، بڑھاپے میں یہ چونچلے نہیں بھاتے۔"

"ہوں، کیا سمجھتی ہو۔ میں اپاہج ہوں تو مرد بھی نہیں رہا" وہ کروٹ لے کر ان کی پلنگ پر آ رہتے۔ اسی لئے تو الگنی پر ہمیشہ جازم تان دیا کرتی تھیں۔ جب بڑی بہو بیاہ کر آئی تو انھیں اپنی جازم کے باندھنے پہ بڑی شرم آئی "ہے ہے جوان بیٹا کیا کہے گا؟

بہو مسکرائی "اے ہمارے اماں ابا تو جازمیں نہیں تانتے۔ یہ تو ابھی تک دولہا دولہن بنے ہوئے ہیں" اس نے کئی بار کہا۔

"بکو مت" بیٹے نے ڈانٹا اور کروٹ لے کر روٹھ گیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر یہ جازم یونہی تنی دیکھی تھی۔ اس کے دل میں اس کا احترام تھا۔ اس کا اپنا وجود بھی اسی جازم کا مرہونِ منت تھا اور پھر آخری دنوں میں جب خلیفہ کا چل چلاؤ تھا تب ان کا ہاتھ خلیفن کے سینے پہ نہ ہوتا

تو انھیں نیند نہ آتی۔ کتنا تشکر تھا ان کے ہاتھ کے بس میں! اور اب نہ الگنی تھی اور نہ ہی جازم کے باہر پڑے ہوئے جوان بیٹوں اور بیٹیوں کے کھٹولے۔ چڑیاں دانا دنکا چگ کر اپنے گھونسلوں میں جا چکی تھیں۔ نئی دنیائیں بسائیں تھیں مگر خلیفن کا پنجرہ سنسان پڑا تھا۔ کبوتر کو سیم دوت اٹھا کرلے گئے تھے کبوتری تنہا پڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ دھڑکتے ہوئے دل پر کسی کا سہارا نہ تھا۔

خلیفن نے کھچڑی کی پتیلی بھوبل پر سے گھسیٹ کر پاس کر لی تھی۔ اب کون سینے میں سجا کر ایک اپنی جان کے لئے جلے۔ چٹنی بھی نہیں پیسی۔ بڑے کو بڑی بھاتی تھی۔ گھی کی لسی طاق پہ رکھی تھی۔ مگر انھیں ہاتھ بڑھا کر اتارنے کی توفیق نہ ہوئی۔ تیسرا روزہ تھا افطاری انھوں نے سب کی سب مسجد بھجوا دی تھی۔ دور دور اپنا کوئی نہ تھا۔ زینب اپنی سسرال گئی ہوئی تھی۔ کتنا کہا گھلی جا رہی ہے بچی کی پڑھائی کا ہرج ہوگا اسے میرے پاس چھوڑ جا۔ مگر کون چھوڑتا ہے اپنی اولاد کو، انسان کس طرح کلیجہ پھاڑ کر پیدا کرتا ہے اور پھر خالی ہاتھ رہ جاتا ہے دودھ چھڑا کر جب بچے کو روٹی چاول پہ لگا دو تو پھر وہ ماں سے ایسے نہیں چمٹتا۔ اولاد بیاہ دو تو اس کے اپنے بال بچے، اس کی ساری محبت، سارا پیار لیتے ہیں بوڑھے ٹھونٹ ماں باپ کے لئے کیا بچتا ہے؟ صحن میں مینھ کی جھڑی لگی تھی مگر خلیفن کی آنکھیں خشک تھیں۔

انھوں نے کھچڑی کی پتیلی چھینکے پر جوں کی توں اٹھا کر رکھ دی۔ لوٹے سے ہاتھ دھو ڈالے ایک رکابی وہ بھی چکنائی کی دھونے میں کون سے ہل بیل لگتے ہیں۔ ہائے اسی باورچی خانے میں کبھی برتنوں کا ڈھیر ہوا کرتا تھا تین چار پتیلیاں چھوٹی بڑی، آٹھ پلیٹیں، چمچے، تھالیاں سینیاں مانجھتے مانجھتے کمر ٹوٹنے لگتی تھی۔ کیا پتہ تھا ایک دن ایک پلیٹ رہ جائے گی وہ بھی سوکھی۔

دروازے پر زنجیر کھڑکی۔ "کون ہو سکتا ہے؟ الٰہی خیر۔ کہیں تار نہ ہو۔ اولاد اللہ نے دور بھیج دی تو پھر ممتا کی رگ بھی مسل دی ہوتی۔ تیری بڑی قدرت ہے پروردگار۔"

"کون ہے؟" انھوں نے پلیٹ طاق میں رکھ کر پکارا۔

"دروازہ تو کھولو۔ میں ہوں ممد۔ کلو کی ماں۔"

"ارے یہ رات کے وقت!" انھوں نے سر پر بوراڈال کر دروازہ کھولا اور آڑ میں

ہو گئیں۔

"کچھ ایسی ہی بات ہے۔" ممد نے دہلیز کے نیچے سر چھپاتے ہوئے مینھ سے بچنا چاہا۔

"ارے مردوئے، کھڑا پانی میں بھیگ رہا ہے منہ سے نہیں پھوٹتا، کیا بات ہے؟"

"وہ ۔ وہ ۔ کوئی دائی کا پتہ مل جاتا تو۔"

"او ہو۔ تو یہ بات ہے! چپ چپاتے بیاہ بھی رچا لیا اور ہمیں پتہ نہیں۔"

"یہ بات نہیں کلو کی اماں۔" دیوزاد ممد میاں نے بھیگی ہوئی مردہ آواز میں کہا۔

"اے بھائی یہ رات گئے گیارہ بجے پانی آندھی میں پہیلیاں بجھوانے آئے ہو۔ یہ کیا مذاق ہے؟"

"اب ۔ اب تم سے کیا کہوں ۔ بنّو بنّو۔"

"بنّو! ۔ اوئی کون بنّو؟"

"میری لونڈیا۔"

"اچھا ۔ اچھا بنّو ۔ اوئی بنّو نگوڑی ۔ اے مردوئے، تیرا چتیا گھل گیا ہے کیا؟ ۔ ہے ہے، یہ سب باسطے کے لونڈے کے کرتوت ہیں۔"

"دائی کا پتہ بتاتی ہو کہ ۔۔۔ میں جاؤں ۔ لونڈیا کا اتنے میں دم نکل چکا ہوگا۔" ممد میاں بولے۔

"ہے ہے ۔ اب اس وقت دائی کا پتہ کہاں سے بتاؤں۔ مصیبتن کو باؤ گولے کا در دا ٹھا ہے۔"

"اسی کے ہاں سے آ رہا ہوں۔"

"تم کہاں رہو ہو؟"

"مائی کتھان ۔ مگر میں ۔ میں نہیں چاہتا۔ اللہ دئی بڑی حرامزادی ہے۔ سارے محلے میں پھونک دے گی۔ ویسے ہی رہنا دوبھر ہو رہا ہے۔ اب اس کے سوا چارہ کیا ہے کہ جا کر حرامزادی کا گلا گھونٹ دوں۔" ممد میاں جلدی سے مڑ لئے۔

"اے ٹھہرو میاں یہ بھی کوئی طریقہ ہے۔ تم کہو تو میں چلی چلوں اور کیا۔"

"تم ۔ ؟"

"ہاں ایک سے دو اچھے ہو دے ہیں۔ اور تم ٹھیرے مرد آدمی۔ کوئی سواری؟"

"اکہ ہے چھیدو کا۔"

برقعہ سر پر ڈال کر خلیفن نے چٹ لالٹین بجھا محمد میاں کو تالا پکڑا دیا اور لپک جھپک دوڑیں اکہ کی طرف۔ تالا لگا محمد میاں بھی لپکے جلدی سے خلیفن کو سہارا دے کر خود اکہ ہانکنے لگے۔

"اور چھدو موا کہاں ہے؟"

"پئے موا پڑا تھا۔ بہت سر مارا۔ پھر میں اکہ لے کر چلا آیا۔ سالے کو کرایہ بھی نہیں دوں گا۔"

اندھیری کوٹھری میں کالی بھجنگ چٹخی ہوئی چمنی کی لالٹین بھڑک رہی تھی اور کھٹولے پر تیرہ چودہ برس کی تنکا سی لڑکی سسکیاں بھر رہی تھی۔

"نئی میری لاڈو، نہیں۔" خلیفن کا جی بھر آیا۔ انھوں نے بچی کا منہ اپنے دوپٹے کے کونے سے پونچھا۔ پھر اپنے آنسو ضبط کر کے محمد میاں پر چلائیں۔

"کیا میری چھاتی پر کھڑے ہو کاٹھ کے الو کی طرح۔ کوئی صاف ستھری چادر تو دو۔

صاف ستھری چادر کا اس گندے سنڈاس گھر میں کیا ذکر۔ محمد میاں نے اپنی دھلی ہوئی تہمد نکال کر دی۔ دو ایک قمیض بنیائن بھی خلیفن نے لے لئے پھر کواڑ بھیڑ کر انھوں نے برقعہ ایک طرف ڈالا اور آستین چڑھا کر بچی پر جٹ گئیں۔ گودڑ گھسیٹ کر ایک طرف ڈالا۔ دری موڑ کر آدھی اس کے نیچے بچھائی۔ پلنگڑی کو گھسیٹ کر سیدھا کیا۔

"اے کوئی دوسری لالٹین نہیں؟"

"ہو گی کہیں کوٹھری میں۔"

"بھوبل ڈالو۔ تم اسی کو صاف کر دو۔ اتے کوئی موم بتی دے دو۔" محمد میاں نے تیل کی کپی پکڑا دی۔ انھیں ہوش ہی نہیں تھا کہ برقعہ نہیں ہے۔ محمد میاں کی آنکھیں نیچی، وہیں برآمدے میں ایک پانچ برس کی لڑکی اور دو ننھے چھوٹے لڑکے سہمے ہوئے ٹکر ٹکر تک رہے تھے۔

"ان بچوں کو تو سلا دو۔"

"نہیں سوتے حرامزادے۔"

"حرامزادے تو تم ہو مدمیاں جو لونڈیا کی یہ درگت بنوائی اور آنکھوں کی چربی نہ پگھلی "۔
مارے غصّے کے مدمیاں کا منہ لال پڑ گیا۔ ایک دم بھنا کے بولے "چولھے میں جاؤ۔ غارت ہو۔
جو ہوگا سو میں خود دیکھ لوں گا۔ ہمیں تمھاری ضرورت نہیں "۔

"گو اس کھا گیا ہے مردوئے، تو جائے گا" خلیفن غرائیں۔

"تیری ایسی کی تیسی مردار۔ چل نکل یہاں سے" مدمیاں گرجے۔ مارے غصّے کے ان کے
آنسو بہنے لگے اور سارا جسم تھر تھر کانپنے لگا۔

"چل دور ہو موئے" انھوں نے دھڑ سے دروازے بند کر لیے اور مدمیاں سر پکڑ
ہچکیوں سے روتے وہیں بیٹھ گئے۔ بچے بھی رونے لگے۔

کپّی کی روشنی میں آنکھوں نے دیکھا۔ بچی کی آنکھیں چڑھ گئیں۔ دانتی بھنچ گئی اور ہاتھ پاؤں
مڑ گئے۔

"ہائے میری بچی" وہ دھاروں دھار روتی ہوئی اسے سنبھالنے لگی۔ ان کی چیخ سن کر
مدمیاں نے دروازہ کوٹ ڈالا۔ بڑ سخت جان عورت کی ذات دردے کر پھر سنبھل گئی اور انھوں
نے مدمیاں کی سات پشتیں تو م ڈالیں۔ باسط خاں کے پرکھوں کی قبریں کھود کر ان کے سروں
پہ سے کفن کھسوٹ لئے۔ مائی نتھان اور مائی نتھان کے رہنے والوں حتیٰ کہ آگرے کے بانیوں تک
کو نہ چھوڑا۔ وہ روتی جاتی تھیں۔ سوکھی ماری ٹڈا سی لونڈیا دوہری ہوگئی۔

"نہ رو چندا۔ بس۔ ہاں ذرا پٹی پکڑ لے میری بٹیا۔ ہاں میری لاڈو۔ اوپر سانس
نہیں کھینچ۔ ہاں۔ بس نیچے ہی نیچے۔ ان کے ہوتوں سوتوں کی میت جائے۔ دم گھونٹ کے۔
ہاں۔ ہاں۔ ہا۔ آ۔ آن۔"

بچے میں دم نہ تھا۔ جیسے چیتھڑے کا گڈا۔ خلیفن نے لوٹا پوٹا پیروں سے جھلایا۔ دو چار
تھپکیاں دیں۔

"چیں" نئی زندگی پکاری اور مارے خوشی کے خلیفن کے دوگنے آنسو بہنے لگے۔

"بیٹا ہے ماشاء اللہ" دھڑ سے انھوں نے دروازہ کھول کر اعلان کیا۔ ان کا منہ ہاتھ

اور کپڑے خون میں لت پت تھے۔ ڈوپٹہ غائب۔ گوشت کی لال بوٹی کی طرف انھوں نے پیار سے دیکھا اور ممد میاں کے ہاتھ سے لالٹین لے کر کواڑ بھیڑ دیئے۔ ممد میاں کی مسکراہٹ ایک دم کے لئے لپکی اور پھر بجھ گئی۔ خلیفن بھی کھسیانی رہ گئیں۔ مبارکباد کا بھلا کیا موقع تھا۔

"ایک پیالہ دودھ ہوگا؟" انھوں نے بچے کو نہلانے کے بجائے اپنے برقعے سے پونچھ کر ممد میاں کی قمیص میں لپیٹ کر بنو سے چھوٹے بھائی کو پکڑا دیا۔ بچے چاروں طرف بیٹھ کر اس کیڑے کو دیکھنے لگے جو ان کی چھوٹی آپو کے پیٹ سے نکلا تھا۔

بچوں کو سلا کر ممد میاں کی قمیص پہن کر انھوں نے ایک دھلی ہوئی تہمد کا دوپٹہ بنا کر اوڑھ لیا۔ پاجامے کا کیا ہے گھر جا کر بدل لیں گی۔ بوتہ باورچی خانہ تھا جیسے کتے کی کنڈلی۔ نہ جانے کب سے ہانڈیاں پڑی سڑ رہی تھیں۔ ممد میاں کی بہو کے جہیز کے سارے برتن لتھڑے تھے۔

واپسی سحر کے وقت سے پہلے نہ ہو سکی۔ راستے میں ممد میاں نے اپنی بدتمیزی کی معافی مانگی غلطی کچھ خلیفن کی بھی کم نہ تھی۔ ایسے موقعے پر خلیفہ ہوتے تو لگاتے دو جوتیاں چوٹی پکڑ کے۔ بڑا تیہا تھا مرنے والے کا۔

"مگر اتا پھر بھی کہوں گی ممد میاں تمھاری کمزوری ہے۔"

"کیا کروں کلو کی ماں! لونڈیا کا باپ ہونا بھی قیامت ہے۔"

"مرد ہو کے مجھ سے پوچھتے ہو؟ وہ کوئی لاٹ کا بچہ ہی ہووے۔ میں تو چھاتی پر چڑھ کے لہو پی جاتی۔"

اور سچ مچ خلیفن نے خون پی لینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ جب بنو میں ذرا دم آگیا تو ایک دن وہ اپنی زرہ بکتر یعنی اپنا تازہ دھلا ہوا برقعہ نکال کر پہنچیں ممد میاں کے ہاں انھوں نے واجد میاں طوبعرہٗ یعنی بنو کے لونڈے کو تیل مل کر نہلایا۔ یہ ڈھیر سا کاجل بڑی بڑی آنکھوں میں بھرا۔ نذر گذر سے بچانے کو ایک ٹیکا دائیں پیر کے تلوے اور دائیں گال پر لگایا۔ سرخ گرنٹ کا کرتہ جس میں پیلی مغزی لگی ہوئی تھی پہنا کر اودا ہری جھالر کا کنٹوپ پہنایا۔ موزے انھوں نے بساطی کی دوکان پر جاتے جاتے خرید لئے تھے۔ بنو کو انھوں نے گلابی غرارہ کرتا اور فیروزی چنا

ہوا ڈوپٹہ اڑھایا نگوڑی ابھی تھی کتنی جو برقعہ اوڑھتی۔ انھوں نے لمبی سی چادر سر سے پیر تک لپیٹ دی جو اس کی موتیوں کی گرہ گابی تک پہنچ رہی تھی۔

اور یوں قافلہ چلا۔ آگے آگے فیلڈ مارشل یعنی خلیفن برقعے کا نقاب منہ پر منڈھے انکی کھونٹا سی ناک کتارہ بنی۔ گود میں واجد علی خاں ولد واحد علی خاں ولد باسط علی خاں سپرنٹنڈنٹ پولیس ساکن مائی تھان۔ پیچھے ان کے واجد علی خاں کی مختصر سی والدہ، ماجدہ اور ان کے پیچھے محلے کے لونڈوں اور لینڈی کتوں کی فوج۔ خلیفن نے حویلی پر چڑھائی کر دی۔

دربان "نانا، کرتا ہی رہ گیا اور وہ ایک جھپاکے میں غڑاپ سے۔ بنّو کا ہاتھ پکڑ کے اندر، دربان کتوں اور گلی کے بچوں سے جوجھتا رہ گیا۔ اندر سپرنڈنٹی برآمدے میں تخت پر بیٹھی تازہ اخبار "تہذیب نسواں"، کا مطالعہ کر رہی تھیں۔ صاف ستھری چوکیوں پر چٹی چاندنی کسی تھی جس پر گاؤ تکیہ اور گاؤ تکیے کی ہم شکل بیگم سجی ہوئی گوبھی کی کھیر کی ترکیب پر غور کر رہی تھیں۔ لشکر دیکھ کر ان کی چٹی بھنویں کنکھجورہ بن گئیں۔

دندناتی آتو گئیں خلیفن پر ایک دم جی پہ پولیس کی بیگم کی دہشت بیٹھ گئی۔ نقاب الٹ کر ہکلائیں "سلام۔ بیگم صاحب۔ اری بنّو ساس کو سلام کر نگوڑی،" انھوں نے سنبھل کر حکم دیا۔

سوکھا مارا زرد ہاتھ ماتھے پر لگا کر بنّو دوہری ہو گئی۔ چادر کے گھونگھٹ میں اس کے لرزتے ہوئے آنسو جذب ہوتے رہے۔

"کیا ہے خلیفن؟" بیگم نے ترشی سے کہا۔ انھوں نے ان سے بیٹھنے کو بھی نہ کہا۔ تکیے سے لگی عینک اتار کر گھورنے لگی مگر خلیفن قلعے کے اندر پہنچ کر شل ہو گئی تھیں دھم سے بیٹھ گئیں۔

"ارے بیگم پوتا مبارک ہو،" انھوں نے رنگ برنگی پوٹلی بیگم کی گود میں دھر دی۔ بیگم ایسی بدکیں جیسے کسی نے دہکتا انگارہ گود میں ڈال دیا ہو۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" انھوں نے جلدی سے پوٹلی اپنی گود سے الگ رکھ دی۔ "نکل جاؤ کمبختو۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب گھر پہ نہیں ورنہ تھانے پہنچا دیتے۔"

"اے بیگم! ۔ کیسا پتھر کا کلیجہ ہے تمھارا۔" انھوں نے بچے کو چھاتی سے لگا کر کہا۔

"یہ کیا بکواس ہے؟ بھاگ جاؤ تم لوگ ۔ ارے او سبیتا ذرا دیکھ تو میاں پنڈت جی کی طرف ہوں گے۔ لپک کر بلا تو لا۔"

"ہاں ہاں بلوا لو دادا جان کو بھی، پوتے کو دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

"بس بس۔ زیادہ جبڑا نہ ہلاؤ خلیفن بوا۔ یہ بلا اٹھاؤ اور باہر نکلو۔"

"اے ہے۔ اس ننھی سی جان کو بلا کہہ رہی ہو، ذرا دیکھو تو بیگم بالکل کھلونا ہے۔"

"اے تو ہم کیا کریں۔؟"

"ارے کلیجے سے لگاؤ اور کیا کرو ۔ اللہ نے یہ دن دکھایا۔"

"مطلب کیا ہے تمھارا؟"

"مطلب یہ ہے بیگم صاحب، اتنی ننھی نہ بنو، غریب کی لونڈیا مٹی کی گڑیا نہیں کہ چار دن کھیل کے ٹھکرا دیا۔ ہاتھ پکڑا ہے تو صاحبزادے کو نبھانا ہوگا۔"

"مگر خلیفن ۔ واحد میاں نے تو ابھی میٹرک بھی نہیں کیا۔ انشاء اللہ رکھے بی۔ اے کریں گے۔ ولایت جائیں گے۔ تب شادی وادی بھی ہو جائے گی۔" جب تک سرکار نہ آئیں بیگم نے سوچا ذرا نرمی سے بات ہو جائے۔

"ہاں ہاں بیگم، میں یہ کب کہتی ہوں کہ میاں پڑھنا چھوڑ دیں۔"

"اور پھر میں تو اپنی نند کو زبان دے چکی ہوں۔" انھوں نے دبی زبان سے کہا۔

"نند کو زبان دے چکی تھیں بیگم تو لونڈے کو گلے میں رسی ڈال کے رکھا ہوتا کہ بے نتھا بیل دوسروں کی کھیتیاں نہ چرتا پھرے۔ نا بیوی وہ زمانے لد گئے۔" خلیفن پھر گرم ہو گئیں ایکدم بنو پر برس پڑیں۔ "ارے نامراد، کیا ٹسوے بہا رہی ہے اٹھ کے ساس کے پیر پکڑ لے، اور بنو تو جیسے منتظر ہی تھی گرنے کی۔ تیورا کے بیگم کے قدموں پر گر گئی۔ ننھے ننھے سوکھے مارے ہاتھوں سے موٹے چکنے پیر پکڑ کر ان پر ماتھا ٹکا دیا۔

بیگم کے جیسے کسی نے ڈنک مار دیا ہو۔ جھٹکا دیا تو بنو دوہ جاکر سلفچی پر گری۔

"اے ہے جردا۔ تیرا دل ہے کہ موا پتھر، جو لونڈیا کے جگہ بے جگہ چوٹ لگ جاتی تو؟"

"اری خیرن، باقر، اللہ دئی۔ ذرا لینا اس حرامزادی کو۔ نکالو تو اسے جوتیاں مار کے۔"

"جوتیوں کی بچی! حرامزادی تو اور تیری سات پشتیں۔ بڑی لاٹ صاحب کی بچی آئی کہیں سے۔ چونڈا پکڑ کے اتنی جوتیاں لگاؤں گی کہ باوا کا نام بھول جائے گی"۔ شیرنی کی طرح خلیفن گرجیں۔ بنّو اور اس کا بچہ چلا چلا کر رونے لگے۔

"ارے یہ کیا قصہ ہے؟" سپرنٹنڈنٹ صاحب گرجے۔ یہ ڈیل ڈول۔ یہ بڑی مہندی میں رچی ہوئی مونچھیں۔ گول انڈا سی توند۔ چست پاجامہ اور باریک لکھنؤ کی چکن کا کرتہ پہنے، شکاری ہیٹ گرمی سے بچنے کو لگا لیا تھا۔ عجیب توپچیوں کی شکل کے لگ رہے تھے۔ کبھی بڑے حسین ہوں گے اب تو پھٹکار برسنے لگی تھی۔

"سلام میاں"، خلیفن پھر لچک گئیں۔

"سلام خلیفن بوا۔ کہو، اچھی تو رہیں؟" پولیس والے بڑے ہوشیار ہوتے ہیں۔

"آپ کی دعا ہے سرکار۔"

"بیگم۔ کھانا تیار ہے؟" انھوں نے نرمی سے خلیفن کو ٹالنا چاہا۔ مہذب زبان میں اس کا مطلب ہے، آپ تشریف لے جائیے کیونکہ کھاتے وقت صرف رذالے روٹی ٹکڑے کی آس میں ٹھہر جاتے ہیں۔ مگر خلیفن کو کون ٹال سکتا تھا۔

"اے قربان جاؤں سرکار کے، کیا دادا جان کو مڑ مڑ کر دیکھ رہے ہیں۔ واجد میاں، آنکھیں تو سرکار بالکل آپ کی جیسی نرگسی ہیں۔"

"بیگم! یہ کیا بکواس ہے؟" باسط میاں کے ہاتھ کی لرزش چھپائے نہ چھپی۔

"مجھ سے پوچھئے سرکار — یہ بنّو آپ کی بہو — محمد میاں کی لونڈیا۔ واجد میاں۔"

"خاموش — بدتمیز۔ کیا ثبوت ہے تمھارے پاس؟"

"سرکار سارا محلہ گواہ ہے۔ آپ کے ڈر سے کوئی بولتا نہیں۔"

"محلہ گواہ ہے؟ سچی بات ہوتی تو سب ہی کہتے کیا میں نے ان کا منھ بند کیا ہے؟"

"سرکار آپ سے کوئی بھید نہیں چھپا۔ یہ واحد میاں کا ہے۔ صورت دیکھئے یہ پٹھانی آنکھیں کہاں چھپیں گی، ابھی سے پولیس والوں کی طرح اکڑے ہے۔" انھوں نے بچے کو بانہوں میں جھلا کر کہا۔ "سرکار رحم کیجئے اس ننھی سی بچی پر سوچئے میاں۔ اس کا کیا ہوگا۔ اسے کون قبول کرے گا ___ محمد میاں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔"

"اول تو تم بکتی ہو، واحد میاں ایسے گئے گزرے بھی نہیں کہ موریوں میں ناک ڈالتے پھریں۔ دوسرے وہ ابھی پڑھ رہے ہیں اور پھر ان کی عمر ہی کیا ہے۔

"پڑھنے کو کون روکتا ہے میاں جم جم پڑھیں اور میاں بچہ پیدا کروانے کے لائق ہیں کہنے کو ابھی جھنڈولے ہی ہیں۔"

"بکواس مت کرو۔" سولہ سترہ برس کے واحد خاں اوپر روشندان سے آنسو بھری آنکھوں سے یہ ڈرامہ دیکھ دیکھ کر کانپ رہے تھے۔

"میاں ذرا سوچئے۔ آپ اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیں۔ اس کی عزت رہ جائے گی۔ آپکے عروج کو دعائیں دے گی۔ ایک کونے میں پڑی رہے گی۔ دور دٹیاں تو آپ کے کتے بھی کھا لیتے ہیں۔" انھوں نے لرزتی ہوئی بنّو کا گھونگھٹ سرکا دیا۔ "اس کی صورت دیکھئے سرکار۔"

"ہم اپنی بہن کو زبان دے چکے ہیں خلیفن۔" سوکھی ماری بنّو کی طرف آنکھ اٹھانے کی اُن کی ہمت نہ ہوئی۔

"تو سرکار شرع میں تو چار کی اجازت ہے۔ واحد میاں شوق سے پھوپی کی بیٹی بیاہ کر لائیں۔"

مگر اب باسط خاں کا پارہ چڑھنے لگا۔ پرانی تھانیداری کی رگ ابھر آئی۔ انھوں نے نوکروں سے کہا۔ "دھکے دے کر نکال دو سالی کو۔"

بس گالی کا سننا تھا کہ خلیفن جوالامکھی کی طرح پھٹ پڑیں۔

"تیری ایسی کی تیسی حرام خور، دغاباز۔" آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ گریبان پکڑ کر جیتی جوتی تڑاتڑ چار پانچ رکھ ہی دیں۔ باسط خاں نے جھنجھلاتے ہوئے ریچھ کی طرح انھیں جھٹکا۔ مگر

انھوں نے باؤلی کتیا کی طرح دانت گڑو دیئے، کرتا جھیر جھیر کر دیا۔ مونچھیں کھسوٹ ڈالیں۔ ایسی مردمار تو کبھی نہ تھیں۔ پر آج ان پہ جانو مرگھٹ کی بھتنی سوار ہو گئی تھی۔

ہونا کیا تھا۔ دھکے دے کر حویلی سے نکال دی گئیں۔ بچے کی پوٹلی دبائے وہ لمبے لمبے ہاتھ چلاکر باسط خاں اور ساری پولیس فورس کو مغلظات سنا رہی تھیں۔

"اے محلہ والو ڈوب مرو۔ ارے یہ سپوڈنٹ ہے کہ شیطان۔ اس کالونڈا پرائی بچی کی عزت مٹی میں ملائے۔ انھیں پیٹ رکھائے اور تم ہیجڑوں کی اولاد کان میں تیل ڈالے بیٹھے رہے۔ ارے ایک دن تم سب کی جوروئیں، بیٹیاں، پوتیاں، نواسیاں بھکائے گا۔" انھوں نے کھڑکیوں دروازوں میں سے جھانکتے ہوئے لوگوں سے کہا۔ "ہے ہے چوڑیاں پہن کر گھروں میں گھس جاؤ۔ بیوی کے لہنگے تلے۔" انھوں نے لالہ جی کو دروازے کی آڑ سے چوہے کی طرح جھانکتے دیکھ کر پکارا، بے چارے نے کھٹ سے دروازہ بند کر لیا۔

ممد میاں گھر میں سر پکڑ کر بیٹھے تھے۔ خلیفن نے انھیں کہیں کا نہ رکھا۔ محلے میں سر اٹھا کر چلنا دوبھر ہو جائے گا۔ ہنکارتی ہوئی جب وہ بچے اور بنّو کو لے کر پہنچیں تو ان کے پیچھے لونڈوں کی ڈھیری نہیں لگی ہوئی تھی۔ بچے انھیں ایسے دیکھ رہے تھے جیسے پورس کی طرح سکندر اعظم کے دربار میں منھ توڑ جواب دے کر آئی ہوں۔ ارے خلیفن بوا کی ہمت تو دیکھو۔ سپوڈنٹ صاحب کی مونچھیں اکھاڑ دالیں۔ مگر ممد میاں کا تو جی چاہ رہا تھا کہ خلیفن کو چاب کر تھوک دیں موری میں۔ مگر اس سے پہلے کہ ممد میاں ان پہ حملہ کرتے وہ بھپری شیرنی کی طرح انھیں پہ برس پڑیں۔ برقعہ اتار کر انھوں نے ان کے منھ پر دے مارا۔ "تو۔ یہ برقع پہن کر نکلنا آج سے۔"

"بس خلیفن بہت ہو لیا۔ اب سیدھی طرح اپنے گھر کا راستہ ناپو۔ میری زندگی میں ویسے کون سی بہاریں تھیں جو اور تم نے کانٹے بو دیئے۔ سپرنٹنڈنٹ ہے خالہ جی کا داماد نہیں کوئی اڑنگا لگا کر چکی پسوا دے گا اور میری ٹال کو آگ لگا دے گا سو الگ نہ جانے کون منحوس گھڑی تھی جو تم سے پالا پڑا۔ اس سے تو یہ بے حیا رنڈی مر گئی ہوتی۔" انھوں نے بنّو کو ایسا ریپٹ لگایا کہ وہ جا کے گری اوندھے منھ۔

"سرکار آپ سے کوئی بھید نہیں چھپا۔ یہ واحد میاں کا ہے۔ صورت دیکھئے یہ پٹھانی آنکھیں کہاں چھپیں گی، ابھی سے پولیس والوں کی طرح اکڑے ہے۔" انھوں نے بچے کو باہوں میں جھلا کر کہا۔ "سرکار رحم کیجئے اس ننھی سی بچی پر سوچئے میاں۔ اس کا کیا ہوگا۔ اسے کون قبول کرے گا۔ مدمیاں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔"

"اول تو تم بکتی ہو، واحد میاں ایسے گئے گزرے بھی نہیں کہ موریوں میں ناک ڈالتے پھریں۔ دوسرے وہ ابھی پڑھ رہے ہیں اور پھر ان کی عمر ہی کیا ہے۔"

"پڑھنے کو کون روکتا ہے میاں جم جم پڑھیں اور میاں بچہ پیدا کروانے کے لائق ہیں کہنے کو ابھی جھنڈولے ہی ہیں۔"

"بکواس مت کرو۔" سولہ سترہ برس کے واحد خاں اوپر روشندان سے آنسو بھری آنکھوں سے یہ ڈرامہ دیکھ کر کانپ رہے تھے۔

"میاں ذرا سوچئے۔ آپ اس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیں۔ اس کی عزت رہ جائے گی۔ آپکے عروج کو دعائیں دے گی۔ ایک کونے میں پڑی رہے گی۔ دو روٹیاں تو آپ کے کتے بھی کھا لیتے ہیں۔" انھوں نے لرزتی ہوئی بنّو کا گھونگھٹ سرکا دیا۔ "اس کی صورت دیکھئے سرکار۔"

"ہم اپنی بہن کو زبان دے چکے ہیں خلیفن۔" سوکھی ماری بنّو کی طرف آنکھ اٹھانے کی اُن کی ہمت نہ ہوئی۔

"تو سرکار شرع میں تو چار کی اجازت ہے۔ واحد میاں شوق سے پھوپی کی بیٹی بیاہ کر لائیں۔"

مگر اب باسط خاں کا پارہ چڑھنے لگا۔ پرانی تھانیداری کی رگ ابھر آئی۔ انھوں نے نوکروں سے کہا۔ "دھکے دے کر نکال دو سالی کو۔"

بس گالی کا سننا تھا کہ خلیفن جوالا مکھی کی طرح پھٹ پڑیں۔

"تیری ایسی کی تیسی حرام خور، دغاباز۔" آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ گریبان پکڑ کر جھپٹی جوتی اتار تڑ تڑ چار پانچ رکھ ہی دیں۔ باسط خاں نے جھنجھلائے ہوئے ریچھ کی طرح انھیں جھٹکا۔ مگر

انھوں نے باؤلی کتیا کی طرح دانت گڑو دیئے، کترا جھیر جھیر کر دیا۔ مونچھیں کھسوٹ ڈالیں۔ ایسی مردمار تو کبھی نہ تھیں۔ پر آج ان پر جانو مرگھٹ کی بھتنی سوار ہو گئی تھی۔

ہونا کیا تھا۔ دھکے دے کر حویلی سے نکال دی گئیں۔ بچے کی پوٹلی دبائے وہ لمبے لمبے ہاتھ چلا کر باسط خاں اور ساری پولیس فورس کو مغلظات سنا رہی تھیں۔

"اے محلہ والو ڈوب مرو۔ ارے یہ سپوڈنٹ ہے کہ شیطان۔ اس کالونڈا پرائی بچی کی عزت مٹی میں ملائے۔ انھیں پیٹ رکھائے اور تم ہیجڑوں کی اولاد کان میں تیل ڈالے بیٹھے رہے۔ ارے ایک دن تم سب کی جورؤیں، بیٹیاں، پوتیاں، نواسیاں بھگائے گا۔" انھوں نے کھڑکیوں دروازوں میں سے جھانکتے ہوئے لوگوں سے کہا "ہے ہے چوڑیاں پہن کر گھروں میں گھس جاؤ۔ بیوی کے لہنگے تلے۔" انھوں نے لالہ جی کو دروازے کی آڑ سے چوہے کی طرح جھانکتے دیکھ کر پکارا، بے چارے نے کھٹ سے دروازہ بند کر لیا۔

ممد میاں گھر میں سر پکڑ کر بیٹھے تھے۔ خلیفن نے انھیں کہیں کا نہ رکھا۔ محلے میں سر اٹھا کر چلنا دوبھر ہو جائے گا۔ ہنکارتی ہوئی جب وہ بچے اور بنّو کو لے کر پہنچیں تو ان کے پیچھے لونڈوں کی ڈھیری نہیں لگی ہوئی تھی۔ بچے انھیں ایسے دیکھ رہے تھے جیسے پورس کی طرح سکندر اعظم کے دربار میں منھ توڑ جواب دے کر آئی ہوں۔ ارے خلیفن بوا کی ہمت تو دیکھو۔ سپوڈنٹ صاحب کی مونچھیں اکھاڑ دالیں۔ مگر ممد میاں کا تو جی چاہ رہا تھا کہ خلیفن کو چاب کر تھوک دیں موری میں۔ مگر اس سے پہلے کہ ممد میاں ان پر حملہ کرتے وہ بپھری شیرنی کی طرح انھیں پہ برس پڑیں۔ برقعہ اتار کر انھوں نے ان کے منھ پر دے مارا۔ "تو۔۔ یہ برقع پہن کر نکلنا آج سے۔"

"بس خلیفن بہت ہو لیا۔ اب سیدھی طرح اپنے گھر کا راستہ ناپو۔ میری زندگی میں ویسے کون سی بہاریں تھیں جو اور تم نے کانٹے بو دیئے۔ سپرنٹنڈنٹ ہے خالہ جی کا داماد نہیں کوئی اڑنگا لگا کر چکی پسوا دے گا اور میری ٹال کو آگ لگا دے گا سو الگ نہ جانے کون منحوس گھڑی تھی جو تم سے پالا پڑا۔ اس سے تو یہ بے حیا رنڈی مر گئی ہوتی۔" انھوں نے بنّو کو ایسا ریپٹ لگایا کہ وہ جا کے گری اوندھے منھ۔

"خبردار جو تم نے لونڈیا پہ ہاتھ اٹھایا۔ مارنا ہے تو مجھے مارو بنّو کے باپ ۔ قصور میرا ہے۔ آگ لگے میری زبان کو۔ میں نے تو لونڈیا کے بھلے کو یہ فضیحتا مول لیا۔" انھوں نے بچہ بنّو کی گود میں دے اور پٹی پٹائی شکل لئے چل پڑیں اپنے اجاڑ گھر کی طرف۔

سارا دن خلیفن روزے میں تھکی ہاری کھرّی چارپائی پہ پڑی دھاروں دھار رویا کیں۔ انھیں افطار کی بھی فکر نہ تھی وہ سچ مچ جلتا توا تھیں۔ بس کی گانٹھ جس چیز میں ہاتھ ڈال دیں اس کا کباڑا ہو جائے۔ سچ تو ہے جو ہونا تھا ہو چکا۔ چپ چاپ کہیں بنّو کو کوئی بڈھا کھڈا دولہا تو مل ہی جاتا۔ مگر اب جو یہ تھڑی پٹ گئی تو کوئی تھوکے گا بھی نہیں۔ پھر پولیس والے ہوتے ہیں ذرا بسیلے بچھو۔ باسط خاں کے ڈنک سے بچنا مشکل ہے۔ آج خلیفن کو اپنے نکمّے پن کا یقین ہو گیا۔ اسی زبان کی خاطر بھودا ماد سے نہ بنی۔

عصر کی نماز پڑھ کر سلام پھیر رہی تھیں کہ آہستہ سے کنڈی کھڑکی۔ "یا علی۔ یا پیر دستگیر۔ اے مولا، بارہ اماموں کا صدقہ پولیس چوکی کا آدمی نہ ہو۔ اے خدا رحم۔" کانپتے لرزتے ہاتھوں سے کنڈی کھولی تو کوئی نظر نہ آیا۔ اطمینان کا سانس لے کر بند ہی کرنے والی تھیں کہ واحد میاں بھیگی بلی بنے دیوار کے پاس سکڑے نظر آئے۔

"الٰہی خیر۔" بوا کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

"کیا کام ہے لڑکے؟" وہ رکھائی سے بولیں۔

واحد میاں نے کٹی ہوئی گاڑے کی طرح ڈرتے ڈرتے گردن گھمائی۔

"اندر آجاؤ بیٹا۔" بوا ایک دم نرم پڑ گئیں۔

واحد خاں پلنگ کی پٹی پہ سر جھکائے بیٹھ گئے۔ آستین سے پیشانی کا پسینہ پونچھ کر بولنا چاہا مگر گلے میں آواز گھٹ گئی آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو نکل پڑے۔

"مرد بچے ہو کر روتے ہو۔ اس بدبخت کا تو خیال کرو۔ ذرا سی بچی پہ کیا بیت گئی میرا تو کلیجہ شق ہوا جائے۔ کچی عمر کے جاپے پہ اس ننھی سی کلی پہ کیا گزری ہوگی۔ بڑے ہو جاؤ گے پتہ چلے گا۔ میاں تمھارا کیا بگڑا۔ ماشاء اللہ بی اے، ایما پاس کرو گے، لندھن جاؤ گے۔ دولھا بنے

گھوڑی پر چڑھ کر نواب زادی بیاہ لاؤ گے۔"

"نہیں بوا میں سنکھیا کھا لوں گا۔" واحد میاں کی ہچکی بندھ گئی۔

"لعنت ہے تمہاری اوقات پر۔ تم مزے سے قبر میں جا لیٹو گے اور وہ تمہارا گناہ چھاتی سے لگائے گلی گلی ٹھوکریں کھاتی پھرے گی۔ کیا پھول سا ہے واجد باپ کی شکل ہے ماشاء اللہ۔" واحد کے کان سرخ ہو گئے۔ کمسن باپ جس کی ابھی مسیں بھیگ رہی تھیں نامعلوم سے غرور سے مسکرا پڑا۔ مگر دوسرے لمحے پھر ہونٹ کانپنے لگے۔

پھر نہ جانے کیا ہوا۔ بوا کو تو فرصت نہ تھی۔ اپنے ہی آنسوؤں سے محلے میں افراتفری پڑ گئی۔ بنا مائی تھان میں مسجد کے سامنے پولیس کی چوکی لگ گئی۔ محلے کے شہدوں نے سپرنٹنڈنٹ کا مکان جلانے کی کوشش کی۔ مسجد میں نماز مغرب میں بڑی ہڑبونگ مچی۔ ملاجی تو فتویٰ دیتے تھے کہ سنگسار کر دینا چاہئے شرع شریف کا یہی حکم ہے۔ پر محلے کے نوجوانوں نے ہلڑ مچا دیا۔ ان چھوکروں کو تو دنگے فساد کے لئے کوئی بہانہ چاہئے۔ ذرا سی بات پہ لال جھنڈیاں لے کر طوفان مچانے لگتے ہیں۔ ذرا سی دیر میں باسط خاں کا پتلا بنا کر چوراہے پہ جلا دیا گیا۔ کسی سرپھرے نے رائے دی کیوں نہ حویلی ہی کو پھونک دیا جائے۔ بات بڑھی پولیس آ گئی لاٹھی چارج ہوتے ہوتے بچا۔ بات اوپر تک پہنچ گئی۔ دو چار اخباروں نے بھی اس لطیفے سے فائدہ اٹھایا اور نہایت سنگین قسم کے کارٹون نکل گئے۔ پیر کو افطار سے پہلے ہی سپرنٹنڈنٹ صاحب محمد خاں کے دروازے پر کنڈی کھٹکھٹانے پہنچ گئے۔

"خلیفن جانیں ہم کچھ نہیں جانتا۔" محمد خاں نے صاف کہہ دیا اور روزے میں بوکھلائی برقعے کا پرچم اڑاتی، بیگم بھی اتنے میں پہنچ گئی تھیں۔

"محمد بھائی جو ہونا تھا ہو گیا۔ قاضی صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ نیک کام میں دیر نہیں ہونا چاہئے۔" بیگم کھمبے کی آڑ میں کہہ رہی تھیں۔

"میں نے کہہ دیا کہ خلیفن جانیں۔ میں کون ہوتا ہوں بیچ میں بولنے والا۔" خلیفن نے جاتے ہی مورچہ سنبھال لیا۔ جھٹ سے چارپائی پہ دری اور چادر بچھائی۔ ایک ٹین کی کرسی باسط خاں

کی طرف بڑھائی۔

"ہاں صاحب دیر کی کیا ضرورت ہے۔ کوئی دم میں قاضی صاحب آتے ہوں گے۔"

"ارے نیک بخت کچھ شربت وربت کا انتظام کرو۔" انھوں نے ممدمیاں کو ڈانٹا۔

نکاح کے بعد سب محلے کے معززین نے مل کر روزہ افطار کیا۔ محلے کے وہی لفنگے جو گھڑی بھر پہلے باسط خاں کی ارتھی جلارہے تھے باسط خاں زندہ باد کے نعرے لگانے لگے۔ باسط خاں کو صرف ایک شکایت تھی کہ پوتے کا نام خلیفن نے بدذاتی میں واجد خاں، ان کے اپنے باپ کے نام پر رکھا۔ حالانکہ واحد میاں کے بیٹے کا نام ساجد میاں عرصہ ہوا طے پاچکا تھا۔ خیر اب انشاءاللہ عقیقہ پہ ساجد ہی نام رکھا جائے گا۔

خلیفن دانت نکوسے لپ جھپ سب کی خاطریں کر رہی تھیں۔ دوڑ دوڑ کر سب کو شربت پلا رہی تھیں۔ گلی میں بدمعاش لونڈے شربت کی کٹوریاں پی پی کر نعرے لگا رہے تھے۔ "خلیفن زندہ باد۔"

"اے چپ رہو حرام خورو۔" خلیفن شرما شرما کر انھیں کھجوریں اور نان خطائیاں بانٹ رہی تھیں۔

پھر ایک معرکہ اور ممدمیاں نے خلیفن کی چوکھٹ پہ سر کیا۔ جا کر انھوں نے کنڈی کھٹکھٹائی اور بالکل جیسے کوئی پڑوسن سے نون مانگے خلیفن کی خدمت میں نکاح کا پیغام پیش کر دیا۔ پہلے تو منھ پھاڑے خلیفن بھونچکی سی رہ گئی۔ پھر جو بھری ہیں تو خدا کی پناہ۔

"حرامزادے کلموہے۔ چرکٹے۔ چیتھر قناتی — اے تجھے ڈھائی گھڑی کی آئے۔ تجھے طاعون سمیٹے۔ تیری میت اٹھے!" پھر جو جوتی لے کر پلی ہیں ممدمیاں پر تو پلٹین نکال دیا۔ مگر ممدمیاں درمحبوب پہ گردن کٹانے کا تہیہ کر کے آئے تھے۔ جوتیوں اور گالیوں کی بوچھار کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ اندر آ گئے۔ وہ جوتیاں برسا رہی تھیں۔ ممدمیاں کہنیوں سے وار روکتے جا رہے ہیں اور اظہار عشق کرتے جا رہے ہیں۔

"اری سن تو نیک بخت — اری خلیفن — تجھے میری قسم — میری بات تو سن — رات کو — نیند نہیں آتی۔"

"اے تو جا قبر میں، موئے — تجھے ہیضہ لے جائے۔"

"نکاح کر رہا ہوں۔ کوئی بری نظر نہیں ڈالی۔"

"اے ہے، اٹھائی گیرے، ڈھونگی — تو بری نظر ڈالے گا۔ تیرے دیدے نہ پھوڑ دونگی۔ میری محبت کا تو نے یہ پھل دیا ہے — کمینے — نکل — نکل میرے گھر سے۔"

"بس جی بس — بڑھتی ہی چلی جاتی ہو۔" ممد میاں نے ہاتھ مروڑ کر جوتی چھین کر الگ پھینکی۔

"اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

"قصور؟ — قصور تو میرا ہے — بدمعاش کہ تیرے لئے محلے بھر سے جھگڑا کیا۔ تیرے بچوں کو اپنا سمجھا۔" خلیفن کا گلا بھر آیا۔

"تو جب اپنا سمجھا ہے تو چل کر سنبھالو کمبختوں کو۔" ممد میاں ان کی طرف کھسکے۔

"ارے جا جا۔ گھاس کھا گیا ہے — خبردار جو تو نے ایک قدم بڑھایا۔" وہ پیچھے ہٹیں مگر ممد میاں بڑھتے ہی چلے گئے۔

"موئے جاتا ہے کہ نہیں۔" خلیفن سہم کر دیوار سے چپک گئیں۔

"نہیں خلیفن! جی کرے تو مار ڈال — پر اللہ قسم اب صبر نہیں ہوتا۔" ٹھنڈی آہ بھر کے ممد میاں بالکل ہی سٹ گئے۔

"اے ہے موئے — بے شرم —" خلیفن کی آواز گھٹ گئی۔

"دل بے قابو نہیں خلیفن — قرآن قسم —" اور ممد میاں نے لالٹین کی بتی تیل میں اتار کر بجھا دی۔

رات کے دو بجے مسجد سے نکاح کر کے نکلے اور ممد میاں خلیفن کو اکّہ پر بٹھا کر لے چلے تو

ان کے دانت مونچھوں میں بکھرے جا رہے تھے جیسے وہ نئی دُلھن بیاہ کرنے جا رہے ہوں خلیفن بھی کنواری لونڈیا کی طرح کانپ رہی تھی۔

"سچ بتاؤں خلیفن۔ جب پہلے دن بنّو کی زچگی میں تم نے مجھے گالیاں دی تھیں، میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ پر تم بھی تو مجھے چاہنے لگی تھیں۔"

"اے ہے توبہ! خدا نہ کرے۔" خلیفن بھنائیں۔

"اب ہم سے جھوٹ نہ بولو۔ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ بھلا تمھاری نیت صاف ہوتی تو میرے دل میں میل کیوں آتا؟" محمد میاں نے جرح کی خلیفن بوکھلا گئیں۔

"تجھ پر خدا کی سنوار۔" انھوں نے حلق میں موٹی سی گالی دبا کر کہا۔ اگر قسمت نے محمد میاں کو ان کا خدائے مجازی نہ بنا دیا ہوتا تو وہ ان کی سات پشتوں کو پنیتیں۔

"بس تو بچوں کی وجہ سے۔" وہ چپ ہو گئیں۔

"بچوں کی اتّی فکر ہے ظالم! اور بچوں کا باپ آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔" محمد میاں نے کہنی سے خلیفن کا گھٹنا دبا کر کہا۔

"دنیا کیا کہے گی؟"



قرۃ العین حیدر

چھُٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا

یاد ایک ایسا پرسکون اور طوفانی، شفاف اور گدلا سمندر ہے جس کی تہہ میں ان گنت شکستہ جہازوں، جگمگاتے خزانوں اور لاشوں کے شہرِ خموشاں دفن ہیں۔ ان زیر آب بلوریں محلات میں سمندری پھول تیرتے پھرتے ہیں۔ سبز اور نیلی موجوں کے عکس ان ایوانوں میں لہریں مارتے ہیں اور روزمرہ کی روشنی میں مونگے کی چٹانوں سے پیچھے چھپی جل پریوں کی آوازیں اس سیال ابدی سناٹے میں مدھم مدھم گونجتی ہیں (یہ آوازیں اگر آپ ساحل پر کوئی سیپی اٹھا کر کان سے لگائیے تو آپ کو سنائی دیں گی) منور، نازک سنہری مچھلیاں اور ہیبتناک شارک چکر کاٹتے ہیں اور وقت کے نئے طوفانوں میں نئے جہاز ڈوب کر اسی تہہ میں جا بیٹھتے ہیں۔ مزید لاشوں اور مزید خزانوں کے انبار کا اس زیر آب شہرِ خموشاں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ وقت کے ساتھ تہ میں پڑی پرانی لاشیں اور گہرائی میں ڈوبتی چلی جاتی ہیں۔ ان کی شکلیں مدھم پڑ جاتی ہیں اور جواہرات ماند پڑ جاتے ہیں اور شکستہ جہاز پھپل پھپل ہو کر پانی میں گھل جاتے ہیں۔ اسے "بھول جانا" کہا جاتا ہے۔

ایسا صدیاں گزرنے پر بھی ہوتا ہے اور ایک ایک برس، یا ایک مہینہ گزرنے پر بھی۔ بھول جانے یا یاد رکھنے کی کوئی مقررہ میعاد نہیں۔

انسان ہزاروں اور صدیوں کے پیمانے سے اپنے اجتماعی ماضی کو ماپتا ہے۔

اس کی اپنی عمر اس قدر مختصر ہے کہ وہ اپنے تصورِ زماں کو اپنے محدود پیمانۂ وقت سے ہی ماپ پاتا ہے اور اسی کو بے چارہ بہت اہم سمجھتا ہے۔ وقت کے محدود تجربے کو، جو اس کی تیز رفتار زندگی سے مترادف ہے وہ تاریخ کی مجموعیت کے پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے اور سمندر سنسناتا رہتا ہے اس سے مفر نہیں کہ تاوقتیکہ آپ خود دوسروں کے لیے ایک یاد بن کر اس کی تہہ سے جا لگیں۔

۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم میں کانگریس کے عدم تعاون کے اعلان کے موقع پہ یو۔ پی۔ لیجسلیٹو اسمبلی میں اقبال سہیل اعظم گڑھی نے گرج کر برطانوی حکومت کو مخاطب کیا تھا۔

ستم جو ہو گا تو دیکھ لیں گے، کرم کا بھانڈا تو پھوٹ جائے
بلائے قزاق آ کے لوٹیں یہ پاسبانوں کی لوٹ جائے
اچک لیں شاہیں تو غم نہیں ہے قفس تو کم بخت ٹوٹ جائے

اس وقت سارا ہندوستان ایک عظیم قفس تھا لیکن چند سال قبل جب ہمارے جہاز ایس ایس مہاراجہ نے کلکتے سے لنگر اٹھایا۔ تو مجھے معلوم نہیں تھا کہ کیسے اور کن متضاد نظریوں کے تحت آزادی کی لڑائی لڑی جا رہی ہے اور ہنسا اور اہنسا کے کیا معنی ہیں؛ والد کے دوستوں میں سے مولینا ابوالکلام آزاد، مولینا شوکت علی اور حسرت موہانی کے لئے سنا ہے کہ ابھی ابھی برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ابھی معلوم ہوا کہ جیل چل دیئے۔ یہ اہنسا والے لوگ تھے۔ اور ان ہی دنوں جب یہ خبر آتی کہ کسی انقلابی نے وائسرائے بہادر پہ بم پھینک دیا۔ دھڑا دھڑ گرفتاریاں ہو رہی ہیں۔ تو بہت سے گھروں پہ سناٹا چھا جاتا کہ نہ جانے کس ماں کے لال نے پھانسی کی جے مالا پہننے کی سعی کی ہے۔ یہ ہنسا وادی یعنی انقلابی یا دہشت پسند کہلاتے تھے۔

چنانچہ جب روشنیوں سے جگمگاتا جہاز (جس کے عرشے پہ گوانی بینڈ "رول برٹینیا" بجا رہا تھا اور عالمگیر اقتصادی کساد بازاری کا غم غلط کرنے کے لئے صاحب اور میم لوگ بار پہ بیٹھے

بے تحاشا شراب پی رہے تھے یا بال روم میں ناچ رہے تھے کیونکہ بہرحال سراسرلتے پام گوڈا ٹری کے جھرمٹوں میں گھری یہ رومان پرور نوآبادیاں برطانوی امراء کے چھوٹے بیٹوں کے ایڈونچرز اور مالی بہبودی کے لئے ابھی سالم اور محفوظ تھیں۔ یہ سمرسٹ ماہم اور ایولین واڈ کے ناولوں کا مشرق تھا۔ لندن کے اخباروں میں بکری ساتھ لئے "ننگے فقیر" گاندھی کی تصاویر شایع ہوتیں۔ جو ایمپائر کی بیخ کنی کے درپے تھا۔ نئی دلّی کے والسں ریگل لاج کے "مغل باغات" میں لیڈی ولنگڈن سفید سایہ پہن کر والیانِ ریاست کے ساتھ چاہ پیتیں اور کیتھرین میو کا مدر انڈیا کب کا چھپ چکا تھا) بسز رنگ کے پانیوں میں داخل ہوا تو اچنبھا مجھے محض اس بات پہ ہوا کہ سمندر اتنا وسیع ہے "جنے کتنے مزدور لگے ہوں گے تب جاکر اسے کھودا گیا ہوگا؟ میں نے اظہارِ خیال کیا اور ریلنگ میں سے سر نکال کر لہروں کو دیکھا کی۔

صاحب لوگوں کے اس جہاز پہ ہندی غلاموں میں ہم لوگوں کے علاوہ دوسرا کنبہ مولینا رب نواز کا تھا۔ مولینا رب نواز پورٹ بلیئر کے کسی سرکاری محکمے میں آفس سپرنٹنڈنٹ تھے۔ پورٹ بلیئر کی مسجد کے پیش امام اور واعظ بھی تھے اور رخصت ختم ہونے کے بعد انڈامان واپس جارہے تھے۔ وہ سنہری کلاہ، اونچے طرے اور طویل شملے والی ریشمی پگڑی باندھتے تھے اور شلوار پہ فراک کوٹ پہن کر اس کے ساتھ ٹائی بھی لگاتے تھے اور فرنچ کٹ داڑھی بھی رکھتے تھے۔ یہ ملکی سیاست کا غالباً بہت ہی نازک دور تھا۔ اکثر وہ زینے پہ آکر اور صاحب لوگ پہ دور سے ایک نظر ڈال کر زمیندار اخبار کا پلندہ والد کو تھما دیتے اور چپکے چپکے سیاسی تبادلۂ خیالات کرتے رہتے۔ مجھے ان کا حلیہ دھندلا سا یاد ہے۔ مگر یہ سب تفصیلات بڑے ہونے پر والد نے بتلائیں۔

والد نے بتلایا کہ مولانا رب نواز اس دور کے لاہور کی نفیس تہذیب کے پروردہ تھے۔ عربی و فارسی کے عالم تھے۔ بڑے سچے مسلمان اور بے حد باشعور اور حساس انسان تھے اور پیٹ کی خاطر انھیں سرکاری کلرکی کرنی پڑ رہی تھی۔ مولانا کی بی بی ڈھیلی ڈھالی ریشمیں شلوار قمیض میں ملبوس نچلی منزل میں اپنے کیبن میں بند رہتی تھیں۔ مولینا کی بچی فرخندہ جمال میری ہی جتنی رہی ہوگی۔ وہ اکثر کھیلنے کے لئے اوپر عرشے پر آجاتی اور اس کے جانے کے بعد میں پھر جاکر ریلنگ پہ ٹنگ جاتی۔ جہاز

کے بھٹی کی مانند گرم "ہولڈ" میں جیل خانہ تھا۔

چند روز بعد افق پر جزیرے نمودار ہوئے۔ مونگے کی چٹانیں، ناریل کے جھنڈ اور سرسبز، ٹروپیکل پہاڑ۔ پورٹ بلیر کی بندرگاہ قریب آئی بہت سی ڈونگیاں اور موٹر لانچیں جہاز کی سمت بڑھیں۔ بندرگاہ کی عمارت پر یونین جیک لہرا رہا تھا۔ پولیس کے اینگلو انڈین اور کالے سپاہی بندوقیں اٹھائے پہرے پر مستعد تھے۔ سفید سولا ہیٹ پہنے صاحب لوگ رپ رپ کرتا جیٹی پر پھر رہا تھا۔

بینڈ نے "رول برٹینیا" دوبارہ چھیڑا اور جہاز کنارے سے لگ گیا۔ صاحب میم لوگ نیچے اترے۔ مولینا رب نواز کی بی بی بھی سفید تنٹل کاک برقعے میں ملفوف، پھول کی ٹوکریاں سنبھالے اپنے کیبن سے نکلیں۔ نیچے پہنچ کر مولینا نے فرخندہ جمال کو کندھے پر بٹھا لیا اور بی بی کے آگے آگے چلنے لگے۔

سب سے آخر میں ہولڈ میں سے پابجولاں قیدی نکالے گئے۔ یہ انقلابی نوجوان عمر قید کاٹنے کے لیے ایشیا کے سب سے بڑے قید خانے سیلولر جیل لے جائے جا رہے تھے۔

ہمارا مکان بارہ بنگلہ ایک سرسبز پہاڑی کے اوپر جھلملا رہا ہے۔ پیچدار سڑک پر سے اس کے پھاٹک تک پہنچنے کے لیے ایک جاپانی وضع کے چوبی پل پر سے گزرنا پڑتا ہے۔ مکان اونچے اونچے چوبی کھمبوں پر ایستادہ ہے۔ اس کا نام غالباً بڑا بنگلہ کی بگڑی ہوئی بنگالی یا انگریزی شکل ہے احاطے میں سامنے کی جانب ربڑ کے درختوں کا جھرمٹ ہے۔ بڑے بڑے فرانسیسی دریچوں والے برآمدے میں سے سمندر نظر آتا ہے جس کی لہریں باغ کے ڈھلوان سے ٹکراتی رہتی ہیں۔ پرائیویٹ جیٹی پر کھڑی پیلے پردوں والی سفید سرکاری لانچ لہروں پر ڈولا کرتی ہے۔ "بارہ بنگلہ" چوبی عمارت ہے اس لیے نچلی منزل میں جو صرف چوبی کھمبوں کے ایک جنگل پر مشتمل ہے مسلح گارڈ کے علاوہ چھوٹا سا فائر انجن اور آگ بجھانے والوں کا عملہ بھی مستعد رہتا ہے۔ مکان کے عین عقب میں کاجو کے درختوں سے ڈھکا ہوا اونچا پہاڑ ہے۔

انڈامان کے یہ جزیرے اور پہاڑ دراصل برما کے اراکان یوما پہاڑوں کے زیرِ سمندر سلسلے کی

سات سو میل تک پھیلی چوٹیاں ہیں جو سطح آب سے ابھرآئی ہیں۔ کرۂ ارض کی تشکیل اور طبعی تبدیلیوں کے دوران پہاڑ کے پہاڑ انڈر گراؤنڈ ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی جوالامکھی کے بھیانک روپ میں نمودار ہو کر پھٹ پڑتے ہیں۔ جیولوجیکل وقت میں گھری انسان کی زندگی چیونٹی کی عمر سے بھی زیادہ حقیر ہے۔

ڈنڈسو جزیروں کے اس جھرمٹ میں اکثر زلزلے آتے رہتے ہیں۔

ہم ایسے پہاڑوں کی چوٹی پر رہ رہے ہیں جو سارے کے سارے نیلے سمندروں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

انڈمان ملایائی زبان کے ہندومان کی انگریزی شکل ہے۔ ہندومان ملایائی زبان میں ہنومان جی کو کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ رامائن کا جنوب مشرق ایشیا، خصوصاً سیام اور کمبوڈیا وغیرہ کی تہذیب پر صدیوں سے بہت گہرا اثر رہا ہے۔

"ہنومان جی اپنے بندروں سمیت یہاں بھی آن پہنچے تھے؟" بھائی نے گارد کے حولدار رام چندر سے پوچھا جو فیض آباد یعنی اجودھیا کا باشندہ ہے۔

"جی ہاں، بابا۔ کون جانے لنکا تک پل بناتے بناتے کودتے پھاندتے یہاں بھی آگئے ہوں بجرنگ بھلی ہی جو ٹھہرے۔ آکھر ایک سنجیون بوٹی کی کھاتر بھگوان نے سارا پہاڑ ایک ہتھیلی پر اٹھا لیا تھا۔ کہ نہیں؟ ہمیں تو لگتا ہے گسّے میں آکر ان جوالامکھی پہاڑوں کو بھی انھوں نے ہی ساگر میں ڈبو دیا۔" رام چندر نے اپنی لمبی لمبی نوکیلی مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر شفقت سے جواب دیا۔ جغرافیہ کی کتاب میں بھائی نے اسی روز پڑھا تھا کہ سفید فام انڈویوروپین آریوں نے جنوب کی سیاہ اقوام کو حقارت سے بندر کہا تھا۔ کیونکہ وہ قدیم زین نیگرٹو نسلیں وادئ سندھ۔ دکھنی بھارت اور لنکا سے لے کر ملایا اور آسٹریلیا تک بسی تھیں اور جزائر انڈامان ونکوبار کے یہ "ہنومان" یعنی بندر نما وحشی قبائل انہی قبل از تاریخ نسلی خاندان کے افراد تھے۔ اینتھروپولوجی کے ماہرین کے مطابق انڈامان کے قبیلے دنیا کی اوّلین نسل انسانی کے آخری بچے کھچے افراد تھے۔ مگر حوالدار رام چندر کی وہ ہنومان جی والی بات زیادہ میرے جی کو لگی۔

کورومنڈل، بنگال، مالابار، سوراشٹر، سندھ اور لنکا کی بندرگاہوں نے حضرت سلیمان کی سلطنت اور بحیرہ روم کے ممالک اور بابل و نینوا سے تجارت کی تھی۔ فراعنہ مصر کی ممیاں ہند کی ململ اور سوتی چھینٹوں

میں پیٹی جاتی تھیں۔ اور یورپ گر یگری اعظم کے ترجمے کیے ہوئے لاطینی عہد نامہ قدیم میں حضرت ایوب نے فرمایا تھا "میری عقل و فراست کو ہند کے رنگین کپڑوں سے تشبیہہ مت دو۔" گپتا تمدن سارے جنوب مشرقی ایشیا میں پھیلا تھا اور قرونِ وسطیٰ میں عرب تاجر اور چاٹگام کے ملاح دنیا کے سمندروں پر اپنے پھریرے اڑاتے پھرتے تھے۔ مگر جب مشرق کا زوال شروع ہوا اور دنیا کے بازاروں میں ہند کی تجارتی قیادت اور صنعتی دھاک ختم ہو چلی تب بھی، حیدر علی اور ٹیپو سے قبل، دلی کے مغلوں اور بنگال کے نوابوں کو یہ خیال نہ آیا کہ بحری طاقت بھی کوئی شے ہے۔ بے چارے حیدر علی نے نیوی بنائی اور ٹیپو نے مال دیپ پر اپنے بحریے کے ہیڈ کوارٹر قائم کیے۔ مگر اس وقت تک پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ فرض کیجئے، سارے جزیرہ نما کی حفاظت کے لیے نیوی موجود ہوتی تو سولھویں صدی میں یوروپین طاقتیں اس آسانی سے ملک میں نہ گھس آتیں۔ اب مثال کے طور پر ہندوستان دیپ ہی کو لیجئے۔ اگر مغل گورنمنٹ نے یا مانڈلے کے بادشاہوں نے یہاں ایک بحری چوکی قائم کر دی ہوتی اور جو پرتگالی، ڈچ، فرانسیسی یا برطانوی جہاز ادھر سے گزرتا اس میں بھوسہ بھر دیتے۔

چنانچہ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک نقشہ نویس آرچی بالڈ بلیئر نے ایک ایک ٹاپو کی پیمائش کر کے یہاں ۱۷۸۸ء میں نوآبادی قائم کی۔ ان زرخیز ٹاپوؤں پر قبضہ کرنے کے لیے انگریزوں نے اپنی جان لڑا دی۔ کیونکہ ہندوستانی قبائل نے اپنے زہر میں بجھے تیروں اور بھالوں کے ذریعے صاحب لوگ کی ایسی تواضع کی تھی کہ امریکہ کے ریڈ انڈین، افریقہ کے حبشی اور آسٹریلیا کے بُش مین نے بھی صاحبانِ عالیشان کا ایسا بھرکس نہ نکالا ہوگا۔

لیکن انگریز کا اقبال بھی کیا شے ہے۔ صاحب جہاں پہنچتا ہے وہاں گلزار کھلا دیتا ہے۔ اب ان جزیروں پر خالص ولایتی ناموں والے بارونق اور خوبصورت شہر آباد ہیں۔ پورٹ کارنوالس، ایلفنسٹن ہاربر، پورٹ کیمپ بل جیسے اپنے یہاں منٹگمری، ڈلہوزی، کیمبل پور۔

پورٹ بلیئر میں اسکول نہیں تھے۔ لہٰذا ایک برمی نوجوان بھالو کو پڑھانے کے لیے آیا تھا اور خوابناک آنکھوں سے سمندر کو تکتے ہوئے کبھی کبھی برما کی عظمتِ رفتہ کے قصے سناتا۔ جانتے ہو بنگال

اور مشرقی ہند کے برطانوی نو آبادکار زیادہ تر اسکاٹش کیوں ہیں؟ اس لیے کہ اسکاٹ لینڈ کے اجاڑ پہاڑوں پر بھوکے مرتے تھے۔" وہ بڑا جوشیلا برمی تھا۔ "ہر چیز کی ایک اقتصادی وجہ ہے۔ کاز اینڈ ایفکٹ۔" وہ ہوا میں انگلیاں گھما کر بتاتا۔ دس گیارہ سالہ بھائی کی سمجھ میں اتنی بڑی بڑی باتیں نہ آتیں تو وہ اکتا کر چپ ہو جاتا اور سمندر کو تکنے لگتا یا پھر ارکانی قزاقوں کے قصے سنانے لگتا جنھوں نے دو سو سال قبل یہاں اڈے بنا لیے تھے اور مشرقی بنگال کی دریائی تجارت پر حملے کیا کرتے تھے۔ "لیکن یہ پورٹ کیمپ بل جن بزرگ کے نام پر بسایا گیا ہے اُن سے بڑا بحری قزاق ساری دنیا میں نہ ہوگا۔ انھوں نے تو سارے برما ہی پر قبضہ کر لیا۔ یہ سب —" وہ باہیں پھیلا کر اور بچّوں کی طرح آنکھیں گول گول کر کے کہتا۔ "یہ سارا ایشیا ایک سیلور مارکیٹ ہے۔ تم ہندوستانی مہنگے سیلو ہو۔ ہم تم سے ذرا سستے سیلو ہیں۔ بائی بائی۔" اور کرسی سے اچھل کر تیزی کے ساتھ زینے سے نیچے اتر جاتا۔

یہ جزیرے گوگاں اگر یہاں آتا تو تاہیٹی کو بھول جاتا۔ اہلِ ہند کے لیے "کالا پانی" ہیں۔ غدر کے باغیوں کو کالے پانی کی سزا دینے کے بعد سے جزائر کو چیف کمشنر کا صوبہ بنایا جا چکا ہے۔ ۱۸۸۴ء میں لارڈ میو والسرائے ہند سیلولر جیل (جو عام طور سے سلور جیل کہلاتا ہے) کا معائنہ کرتے ہوئے ایک قیدی کے ہاتھوں مارے گئے۔ اس صدی کے شروع سے ملک میں انقلابی تحریک چل رہی ہے اور دہشت پسندوں کو بغیر ٹرائل کے کالے پانی بھیجا جا رہا ہے۔

یہ مرجانی جزیرے سونا اگلتے ہیں۔ گھنے جنگلوں کی قیمتی لکڑی یوروپ اور امریکہ ایکسپورٹ کی جاتی ہے۔ کافی، چاء اور منیلا کے سن کی کاشت کے لیے ایشیا کے سب سے بڑے جیل کے ہزارہا قیدیوں کی بیگار موجود ہے۔

سامنے شیشے والے برآمدے کے کونے میں پرانی وضع (اس وقت وہ نئی وضع تھی) کے ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے تو میں اسٹول پر چڑھ کر اس حد تک پہنچتی ہوں۔ "ہلو۔ ہلو۔ جی ہاں ہم بارہ بنگلہ سے بول رہے ہیں۔"

ہمارا اس نظام سے کیسا سمجھوتہ ہے؟ سمجھوتے کے کیا معنی ہیں؟

ہم سب، ساری دنیا، ساری اقوام، نسلیں، مذاہب، فرقے، طبقے، ممالک، افراد، ہمارے خیالات،

نظریے، تعصبات، فلسفے، ادبیات، علوم و فنون، ہماری مختلف الہیات، روحانی اور جذباتی تجربات، سیاسی، سماجی، تمدنی مسائل، ہماری اجتماعی اور انفرادی شخصیت، ہماری خامیاں اور ہماری خوبیاں، دشمنی اور دوستی، فتح و شکست، کمال اور زوال، دکھ اور سکھ، حسب نسب، تاریخ کی وجوہ کے گنجلک، دھندلے، روشن، واضح، غیر واضح تفاعل کی پیداوار ہیں۔

رات بھر باغ کی کول تار کی سڑک پر گارڈ کے قدموں کی کھٹ کھٹ گونجتی ہے۔ لفٹ رائٹ، لفٹ رائٹ۔ ہالٹ حکم صدر۔ کھٹ کھٹ۔ کھٹ۔ صبح سویرے سر پر سفید رومال باندھے بوڑھی مہتر پہلو کے چوبی زینے پر نمودار ہوتا ہے اور نیچے بھگوتی چرن مالی کھرپا سنبھالے انگوچھا سر پر لپیٹا باغ میں پہنچ جاتا ہے۔ بھگوتی مشرقی یو۔پی سے برآمد شدہ Indenture labour سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا سارا کنبہ دو پیڑھیوں سے کافی کے باغات میں کام کر رہے ہیں، برطانوی پلانٹر جن کے مالک ہیں۔ لارڈ کارنوالس کے نافذ کیے ہوئے استمراری بندوبست کی بدولت جب یو۔پی میں بھیانک قحط پڑا تو آج سے ایک صدی قبل ہزارہا فاقہ زدہ کسانوں کو جہازوں میں بھر بھر کر نیم غلاموں کی حیثیت سے آسام، افریقہ، جزائر غرب الہند، فی جی اور مارشیس میں اہلِ برطانیہ کے پلانٹیشنز پر مزدوری کرنے کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔ ان کی اولاد آج تک وہاں اسی حالت میں موجود ہے۔ بھگوتی انہی لوگوں کا بھائی بند ہے۔

جب سورج نکل آتا ہے تو پینٹری میں سے نور محمد بیرے کی چھینک اور گرجدار الحمد للہ کی آواز آتی ہے۔ نور محمد ضلع جھنگ کا باشندہ ہے اور اپنی بیوی اور اس کے عاشق کو کلہاڑے سے قتل کر کے یہاں تشریف لایا ہے۔ بوڑھا نور محمد ایک نیک دل اور دین دار انسان ہے۔ ہر بات کے جواب میں "ہوں جناب" کہتا ہے جو بہت اچھا جناب کا مخفف ہے۔ نوجوان کلینر اور بوڑھا خانساماں دونوں قاتل ہیں۔ یہ تینوں اچھے اور آزاد قیدیوں میں شامل ہیں۔ ان کی مانند باقی سرکاری مکانوں پر جو ملازم برسوں سے کام کر رہے ہیں انھوں نے بھی زیادہ تر پنجاب کے کھیتوں میں آب رسانی کے جھگڑوں، آبائی عناد اور معاملاتِ حسن و عشق کے سلسلے میں خون خرابہ کیا تھا۔ یہ سب سیدھے سادے جوان، ادھیڑ، بوڑھے، ہندو مسلمان، سکھ، ہندوستانی، پنجابی اور دوسرے صوبوں کے لوگ ہیں۔ ع

تری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

کتے کا نام ایک مسئلہ ہے۔ یہ بے حد محبت شعار الیسشن ہیں پچھلے انگریز افسر سے ترکے میں ملا تھا۔
"ہم اسے آرتھر[1] پکاریں گے"، والد نے فیصلہ کیا۔

مگر وہ آرتھر کے نام پر بیوقوفوں کی طرح چپ بیٹھا دم ہلاتا رہتا کہ ٹیپو کہلانے کی اس کی عادت راسخ ہو چکی تھی۔ چونکہ سب کو منع کر دیا گیا تھا کہ اسے ٹیپو نہ پکارا جائے اس لیے اب وہ گمنام ہی ادھر اُدھر پڑا پھرتا اور متعجب اور پرامید نظروں سے سب کی شکلوں کو تکتا۔

پرکاش چند کلینز یا بندی سے شام کے وقت آرتھر کو ساحل پر ٹہلانے جاتا اور سر جھکا کر اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے جانے کیا سوچتا رہتا ہے۔ اس نے جے پور میں اپنی محبوبہ کے قاتل کو مار ڈالا تھا۔

پرکاش چند تعلیم یافتہ نوجوان ہے۔ اکثر وہ پنڈت رام پرشاد بسمل شاہجہانپوری کا مشہور شعر زیر لب پڑھتا ہے ؎

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

"بھگت سنگھ اور رام پرشاد بسمل اور اشفاق اللہ اور چندر شیکھر آزاد اور ان گنت نوجوان تختۂ دار پر چڑھ چکے ہیں۔ اس وقت سارا ہندوستان بسمل کے اس شعر سے گونج رہا ہے اور میں یہاں ذلت کی موت مروں گا۔" وہ سر اٹھا کر بھائی سے کہتا۔ پھر کوئی سیپی اٹھا کر کان سے لگا لیتا ہے اور سمندر کی آواز سنتا رہتا ہے۔ میں ادھر ادھر ریت پر ماری ماری پھر رہی ہوں اور خوبصورت بڑی بڑی کوڑیاں، سیپیاں اور گھونگھے جمع کرتی جا رہی ہوں۔ تب پرکاش چند ایک سیپی دور پانی میں پھینک کر اچانک بھائی سے کہتا ہے۔" بابا! آپ کو معلوم ہے جب سراج الدولہ کی شہادت کی خبر راجہ رام نرائن موزوں نے سنی تو انھوں نے کیا کیا۔۔؟ ۔ وہ ۔ ایک راجہ تھے پٹنے کے اور شاعر تھے ۔۔۔ یہ خبر سن کر جس کے بعد سے ہندوستان کی دیا بجھ گئی۔ انھوں نے کہا ؎

[1] آرتھر و لزلے

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

— اور کپڑے پھاڑ کر سر پہ خاک ڈالتے گھر سے نکل گئے۔ ''اُدھر'' وہ افق کی سمت باہیں پھیلا کر کہتا ہے۔ ''ادھر، اس ویرانے پر، تب سے لے کر آج تک کیا گزری ہے۔'' اور پھر آرتھر وینزلے کو بلا کر چپ چاپ اس کی ٹہل میں مصروف ہو جاتا۔ اب سورج سمندر میں ڈوب چکا ہے اور بارہ بنگلہ میں روشنیاں جل اٹھی ہیں۔ اور شفق کی سرخی ریت پر لہریں مار رہی ہے۔ میں اور بھائی سر جھکائے اِکّا دکّا سیپیاں اور کوڑیاں چنتے لان کی سیڑھیاں چڑھ کر گھر کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔

''ڈیر جلیل! یہ تو آپ سن ہی چکے ہوں گے کہ میں نے پھر ہندوستان چھوڑ دیا۔ دو برس کے لیے جلاوطنی اختیار کر لی۔ یہاں فرصت ہے اور تنہائی ؎

قیدِ خود اختیاری!

ہوں مبارک دوستو دنیا کی تم کو وسعتیں — میری قسمت میں فقط اک تنگ زنداں رہ گیا
ہم کو کیا اہلِ خرد ہوں محوِ گل گشتِ چمن — چل دیئے اہلِ جنوں خالی بیاباں رہ گیا

انڈمان کا جزیرہ بہت بدنام ہے۔ مگر یہاں عیش بھی ہے۔ کالے آدمیوں کے لیے نہیں جن کی قسمت میں محنت مشقت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ انگریزوں کے لیے ان کی الگ آبادی ہے۔ بنگلے ہیں۔ سبزہ ہے، کلب ہے جس میں میمیں اور انگریز ہر طرف نظر آتے ہیں۔ مگر ہندوستانی شاذ و نادر — میں بھی اس کلب میں شامل کر لیا گیا ہوں۔ مگر چونکہ نہ ناچنا آتا ہے نہ پینا۔ اُلّو کی طرح بیٹھا رہتا ہوں ؎

وہ کسی کے واسطے تو ہو گیا عشرت کدہ
انڈمن کیوں ہند کا منحوس زنداں ہو گیا

آپ لوگوں کی یاد اور تذکرہ ہر وقت رہتا ہے ؎

سیّدین و سرور و قدوائی کا ذکر و خیال
درد بھی یہ ہو گیا اور یہ ہی درماں ہو گیا

خاکسار
سجاد[1]''

---

[1] جلیل قدوائی کے نام یلدرم کے ایک خط سے اقتباس

میں اور بھائی ساحل سے واپس آچکے ہیں۔ آرتھر برآمدے کے فرش پر لیٹا قناعت سے ستا رہا ہے۔ دور دوسرے جزیرے پر جھلملاتے کلب کی روشنیاں دریچے میں سے نظر آرہی ہیں۔ حوالدار رام چندر، ہمارے والدین اور مدراسی ہمسائے مسٹر و مسز کیسودر کو لانچ پر پہنچا کر اندھیرے میں اپنی لالٹین چمکاتا ساحل سے واپس آرہا ہے۔ تاریکی گہری ہو چکی ہے اور چاروں کھونٹ سمندر کی سنسناہٹ خوفناک ہے۔

رام چندر کے قدموں کی چاپ زینے پر سنائی دیتی ہے۔ بھائی برآمدے کے ایک سرے پر ٹیبل لیمپ کے نیچے بیٹھے برمی ٹیچر کو سنانے کے لیے سبق یاد کر رہے ہیں۔ جو کل صبح سویرے پھر آجائے گا۔ روشن لانچ فراٹے بھرتی سمندر کی تاریکی میں غائب ہو جاتی ہے۔ رام چندر مونچھوں کے اندر مسکراتا برآمدے میں داخل ہوتا ہے اور بھائی کے پاس جاکر بڑی رازداری سے کہتا ہے "بابا! کل آپ لوگ ایک تماشا دیکھے گا۔ ٹلی ڈریے گا نہیں۔"

"کیا ہے؟" بھائی موٹی چکردتی میز پر پہنچ کر خوشی سے پوچھتے ہیں۔

"کیا تماشا ہے رام چندر؟ جلدی بتاؤ!" میں جو اب تک کرسی پر کھڑی ہو کر دریچے سے باہر لانچ کو دیکھ رہی تھی فوراً چلاتی ہوں۔

"ابھی نہیں بٹیا — کل سبیرے۔" اتنا کہہ کر حوالدار رام چندر دوسرے زینے سے نیچے اتر جاتا ہے۔ کھٹ۔ کھٹ۔ کھٹ۔ دور پھاٹک پر ٹہلتے پہرے دار کی آواز بلند ہوتی "ہالٹ! حکم صدر —!" کھٹ کھٹ۔ کھٹ۔

وہ ایک قبائلی وحشی بچہ تھا۔ نہ معلوم کس طرح بھٹک کر آبادی میں آنکلا اور بارہ بنگلہ کی عقبی پہاڑی پر کاجو کے جنگل میں چھپ رہا تھا۔ نور محمد تڑکے گجردم پہاڑی کی ایک چٹان پر جاکر نماز پڑھا کرتے تھے۔ سلام پھیرنے کے بعد ان کی نظر اس بچے پر پڑ گئی جو پتوں کی جھالر سی پہنے چند جنگلی جڑیں کھا کر اپنا پیٹ بھر رہا تھا۔ نور محمد کی آدھی زندگی پورٹ بلیئر میں گزری تھی۔ مگر انھوں نے اصل نسل وحشی پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ اسے پکڑنے کو دوڑے مگر بوڑھے آدمی تھے اس کا تعاقب

نہ کرسکے اور وہ چھلاوے کی طرح غائب ہوگیا۔ لیکن شام پڑے تک اسے رام چندر نے ربڑ کے جھرمٹ میں سے ڈھونڈھ نکالا۔ جہاں وہ ایک درخت سے چمٹا سہما ہوا بیٹھا تھا۔

صبح کو والد کے دفتر چلے جانے کے بعد رام چندر وعدے کے مطابق ہمیں تماشا دکھانے کے لیے اسے گھسیٹے ہوئے لے کر اوپر آئے اور برآمدے کے فرش پر اسے اس طرح چھوڑا جیسے بلی کے بچے یا پلے کو بوری میں سے نکال کر زمین پر رکھ دیتے ہیں۔

وہ ایک نو دس سالہ لڑکا تھا لیکن بے حد پستہ قد ہونے کی وجہ سے چار پانچ سال سے زیادہ کا معلوم نہ ہوتا تھا۔ وہ ساحلی چٹانوں کے راستے سے بآسانی اپنے جنگلوں کو واپس جا سکتا تھا۔ مگر شاید وہ کوشش کر کے شہر آیا تھا۔ مہذب انسانوں سے خائف بھی تھا اور غالباً ان کے ساتھ رہنا بھی چاہتا تھا لیکن اپنی خواہش کا اظہار کرنے سے قاصر تھا۔

بارہ بنگلے کا سارا عملہ اس کے چاروں طرف جمع ہوگیا۔ کرۂ ارض کی اولین نسلِ انسانی کا یہ نمائندہ ارتقاء کی پہلی سیڑھی پر پہنچ کر پچھلے ہزاروں برسوں سے اسی سیڑھی پر ٹھٹکا ہوا ابنِ آدم، اردگرد جمع اپنے ترقی یافتہ رشتہ داروں کو خوفزدہ وحشی جانور کی طرح تکتا رہا۔

"ہا۔ نگوڑا ابن مانس کیسے ٹکر ٹکر سب جنوں کو تکت ہے۔" صدیق چپراسی کی بیوی مشتاقن نے جو گھونگھٹ کاڑھ کر کانا پردہ کرتی تھیں، بڑی ممتا سے کہا۔

"تم ہی کا دیکھت ہے ٹکر ٹکر۔" بھگوتی مالی نے کہا۔

"اپنی موسی کا پہچن لیہس بھر جائی۔!" رام چندر، کہ بہت پر مذاق تھے مشتاقن سے بولے۔ مشتاقن پیٹ بھر کے کالی تھیں۔

"کالا منھ نیلے ہاتھ پاؤں۔" مشتاقن نے مصنوعی غصے سے کہا۔

اتنے میں بھگوتی مالی کی بیوی کلبیا اور عزیزن آپا بھی آن پہنچیں۔

"ارے باپ رے۔ ای تو بہوتے بھیانک ہے۔ جیس تیسی مسان، بدارواح۔ توبہ توبہ!" عزیزن نے دہل کر کہا۔

"اِدھر سمندر میں بہت جل مانس رہت ہیں۔" رام چندر نے مسکرا کر مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔

"نا بھیا! ہم کا نا ڈراؤ! ہم رات برات باہر نکلت ہیں۔" عزیزن نے ہاتھ جوڑے۔

"جل مانس ہوں کہ گینڈے، ہم کسی سے نہیں ڈرت ہیں۔ آہ۔ بچ پچ پچ ـــــ"

مشتاقن نے پیار سے چٹکی بجا کر بچے کو اپنی طرف بلانا چاہا اتنے میں نور محمد باقاعدہ کھانے کی بڑے لے کر آ گئے اور پلیٹ اس کے سامنے رکھ دی۔ بچے نے اپنے جھبڑے بال جھٹک کر چاروں طرف دیکھا چاروں ہاتھ پاؤں سے پلیٹ کی سمت چلا اور کھانے کو غور سے دیکھنے لگا۔

"ہا۔ دکھیا چنڈال بن میں سانپ چھپکلی کھا کھا کر جیت ہیں۔" بی مشتاقن بولیں اور اس کے لیے نوالے بنانے کے ارادے سے اکڑوں بیٹھی ہی تھیں کہ اس نے گوریلا کے تھپڑ کی طرح زور سے انھیں ایک ہاتھ رسید کیا۔ مشتاقن زوردار چیخ مار کر وہاں سے بھاگیں۔ افراتفری مچ گئی۔ والدہ صبح سے مسز کیسو در کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ عزیزن انھیں بلانے کے لیے دوڑیں۔ رام چندر بچے کو اچھی طرح پکڑ کر بیٹھ گئے اور اسے کھلانے کی کوشش کرنے لگے۔

"جناب۔ اسے کلمہ پڑھا کر مسلمان کر لیں؟" نور محمد نے چپکے سے صدیق سے تجویز کیا۔

"گورنمنٹ کا آرڈر نہیں ہے۔" صدیق نے اسی سرگوشی میں جواب دیا۔

"کیا۔؟"

"جنگلی والا کو جنگلی والا ہی رہنا مانگتا۔" برمی جمعدار نے نور محمد کو سمجھایا۔

"واہ۔ اور مشنری لوگ کا آرڈر ہے کہ بنائے جاؤ سب کو کرسٹان! ابھی جا کر اسے چپکے سے مولانا صاحب کو دے آتے ہیں۔"

"نور محمد۔" سلامت خاں ہیڈ کانسٹبل نے قریب آ کر ڈنڈا بجاتے ہوئے ذرا ڈپٹ کر کہا۔ "جاؤ جا کر اپنا کام کرو۔"

"ہوں جناب!" نور محمد نے جھاڑن کندھے پہ ڈالا اور سر جھکائے پینٹری کی طرف چلے گئے۔

"ہم بابا لوگ کو تماسا دکھائے کھاتر اس کا اوپر لائے رہے۔ تماسا کھتم پیسہ ہجم۔ چلیے کپتان صاحب۔ اس کا جنگل ما واپس بٹھائے دیں۔"

بچہ سرکاری قانون کے مطابق واپس لے کر جنگل میں چھوڑ دیا گیا"۔ اس پر مضمون لکھو مسٹر"
دوسرے روز برمی ٹیوٹر بھائی سے کہتا ہے۔"ایک انڈامانی لڑکا" اور پورٹ بلیئر کے شب و روز
کے متعلق ہوم ورک کے طور پر بھائی کے لکھے ہوئے "Essays" کی اس شکستہ اور پیلی کاپی
بک کی مدد سے اس وقت میں یہ کہانی لکھ رہی ہوں۔

جزائر کے گھنے اور ناقابلِ عبور جنگل میں قدیم آبادی صرف چند ہزار رہ گئی تھی۔ متعدد
بیماریاں جو نوآبادکار اپنے ساتھ لائے تھے اور اینتھروپولوجی کی اصطلاح میں، متمدّن دنیا سے
تعارف کی وجہ سے قدیم حجری عہد کے یہ قبائل تیزی سے مر رہے تھے۔ تاریک جنگلوں میں جن کے
اندر سانپ اور بھیانک مگرمچھ ایسی چھپکلیاں سرسراتی تھیں۔ یہ بے چارے وحشی تیر کمان سے شکار
کھیلتے پھرتے۔ ان کی بولیوں کا کسی لسانی گروہ سے تعلق نہیں تھا۔ اکثر قبائل کے یہاں بول چال
ہی کا ارتقاء نہیں ہوا تھا اور آگ کے استعمال سے وہ ناواقف تھے۔

اِکّا دُکّا سیاسی قیدی درختوں کے کھوکھلے تنوں کی ناؤ بنا کر فرار کی کوشش کرتے مگر
حکومت نے نسبتاً ترقی یافتہ قبائل کو ان کے تعاقب کے لیے مقرر کر رکھا تھا۔ اور زہر آلود تیروں کی
زد سے بچ نکلنا مفرور قیدیوں کے لیے ناممکن تھا۔ (غالباً ایسی ہی صورت حال کے لیے میرا بائی کہہ
گئی تھیں۔"کوس کوس پر پہرہ بیٹھا۔ پینڈ پینڈ بٹ مار")

اکثر شام پڑے ہم لوگ ہوا خوری کے لیے شہر کے قریبی جنگلوں کی طرف نکل جاتے۔ پورٹ
بلیر اور اس کے پڑوسی شہر ایبرڈین کی روشنیاں اندھیرے میں غائب ہو جاتیں اور کسی گھاٹی
میں سے گزرتے ہوئے میں دفعتاً ناریل کی فرمائش کرتی۔ سڑک پر جاتا ہوا تھوے کے پلانٹیشنز
کا کوئی مزدور ناریل کے درخت پر چڑھتا اور ناریل توڑ کر بندر کی سی پھرتی سے نیچے اتر آتا۔
کافی کے باغات سے نکل کر ہم جنگلوں کی طرف رواں رہتے۔ دور کہیں آگ جلتی نظر آتی۔
سمندری ہوا ساحلی چٹانوں میں سائیں سائیں کرتی۔
راستے میں چاند ملتا۔

"چاند ہمارے ساتھ کیوں چل رہا ہے؟" میں حیرت سے پوچھتی۔
"آپ کو سلام کرتا ہوا جا رہا ہے۔" والد جواب دیتے۔ سارے جزیرے پر تاڑ کے سیاہ درختوں پر، ہری بھری پہاڑیوں پر تیز چاندنی پھیل جاتی۔ بانس کے جھرمٹ ہوا میں سرسراتے۔
ہوائیں بھی میری دوست ہیں۔

کبھی کبھی اتوار کے روز شہر سے مولینا رب نواز مع فرخندہ اور شٹل کارک برقعے میں ملفوف اپنی بیوی کے ہمارے یہاں آتے اور شیشوں والے برآمدے میں بیٹھ کر والد سے باتیں کیا کرتے۔ کلامِ اقبال پڑھتے جاتے اور پگڑی کے شملے سے آنسو پونچھتے جاتے۔ جمعہ کے روز مسجد میں مولینا کے وعظ مسلمان قیدیوں میں اس قدر مقبول ہو چکے تھے کہ انگریزوں کو مولینا کی طرف سے فکر ہو گئی تھی۔

ایک روز روس آئس لینڈ (Ross Island) پر حوالدار رام چندر کے ساتھ چیف کمشنر کے باغ میں سے گزرتے ہوئے اس کے بنگلے کے دریچے میں سے مجھے دو فل بوٹ نظر آئے جو مگدر جیسے چوبی فرموں پر چڑھے ہوئے تھے۔ یہ مسٹر اینڈرسن کی ٹانگیں ہیں۔ جنھیں گھر پر چھوڑ کر وہ خود باہر چلے جاتے ہیں۔ میں نے سوچا اور بے حد ڈری۔
بھائی کی کاپی میں لکھا ہوا ایک قدیم "نرسری گیت"

How many miles to babylon
Three scores and ten
Can I get three by candle-light
yes and back again
If your heels are nimble and light
you can get three by candle light

اچانک بڑی گہما گہمی سی شروع ہو گئی۔ سلور جیل کے چند بنگالی انقلابیوں نے جیل کے حکام کی شدید بدسلوکیوں کے خلاف احتجاجاً بھوک ہڑتال کر دی۔ ان سیاسی اسیروں میں قید تنہائی کاٹنے والے بھی شامل تھے، ان میں سے کچھ نوجوانوں نے دم توڑ دیا۔ شام کو میں نے دیکھا کہ مسٹر اینڈرسن فل بوٹ پہنے کار میں سوار ہو رہے ہیں جو جاپانی پل کے نیچے کھڑی تھی۔ والد کا تعلق جزائر کے محکمہ مالیات سے تھا۔ پینل سیٹلمنٹ کا انتظام علیحدہ اور صرف انگریزوں کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے باوجود جزیرے میں ممکن بغاوت کے خدشے سے بارہ بنگلہ کی مسلح گارد دوہری کر دی گئی۔

دوسرے روز ایک سیاسی قیدی اسٹریچر پر پڑا ہوا نیچے گھاٹی کی سڑک پر سے گذرا۔
"سدھیر کمار بوس یہی ہے۔" پرکاش چندر کلینر نے آہستہ سے بری ٹیوٹر کو بتایا۔ وہ دونوں بھائی کے ساتھ پہلو کے برآمدے کے جنگلے پر جھکے ہوئے تھے۔ میں جنگلے کی جالی میں سے نیچے جھانک رہی تھی۔
"سنا ہے کل بڑا صاحب خود اس کی کوٹھری میں گیا تھا۔ جوتا لات سے بات کرنے۔ اتنا تو یہ کمزور رہے، سینکیا پہلوان، مگر کھاٹ سے اٹھ کر پل پڑا بڑے صاحب پر۔ صاحب بھاگا باہر سرپٹ —" نور محمد نے کہا۔ "اور پولیس کو آرڈر دیا کہ خوب پیٹو۔"
"مسٹر اینڈرسن اپنی ٹانگیں ساتھ لے گئے تھے تبھی تو بھاگے سرپٹ۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔
"اب شاید ٹھکائی کر کے ہسپتال لے جا رہے ہیں، سول سرجن والے ہسپتال، مگر مر جائے گا۔" نور محمد نے آہستہ سے کہا۔ آنکھیں مونچھیں سفید، بنگلہ داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور پلٹ کر آواز دی۔ "آجاؤ ٹیپو، ٹیپو۔ نہیں — توبہ۔ آرتھر۔ آرتھر۔ چلو راتب کا ٹیم ہو گیا۔" اور اندر چلے گئے۔

ایک روز ایام جاہلیت کا افسوسناک خاتمہ ہو گیا۔ والد برآمدے میں بیٹھے ہندوستان سے آئی ہوئی تازہ ڈاک دیکھ رہے تھے۔ میں فرش پر بیٹھی جہازی سائز کے نئے ادبی دنیا اور نیرنگ خیال کے ورق الٹنے پلٹنے میں مصروف تھی کہ غالباً نیرنگِ خیال میں ایک الف لیلوی سے بازار کی رنگین تصویر نظر پڑی۔ جس میں قالین بچھے تھے اور ایک حسین کنیز فروخت کی جا رہی تھی۔ تصویر کے نیچے جلی حروف میں ایک

شعر لکھا تھا[1]۔ میں نے تصویر والد کو دکھا کر ان سے پوچھا "یہ کیا لکھا ہے؟"

انھوں نے چونک کر ذرا رنج کے ساتھ مجھے دیکھا اور کہا "افسوس کہ یہاں آپ بالکل جاہل رہ جائیں گی۔ اب آپ کو پڑھنا شروع کر دینا چاہیے"۔

چنانچہ دوسرے دن مولینا رب نواز کو بلایا گیا۔ جب وہ برآمدے میں آن کر بیٹھے تو نور محمد نے فرطِ عقیدت سے ان کے ہاتھ چومے اور اپنی آنکھوں سے لگائے اور جلدی سے چا اور مٹھائی لا کر ان کے سامنے رکھی۔

"کڑی چار سال چار ماہ چار دن دی ہو گئی اے؟" انھوں نے دریافت کیا اور مطلع کیا کہ جمعے کے روز قاعدہ لے کر آئیں گے۔

اب میں بوکھی میں یہ سمجھی کہ قاعدہ گڑیا کا گھر ہو گا۔ یہ بیوقوفی کی انتہا تھی۔ معلوم تھا کہ مولینا پڑھانے کے لیے آ رہے ہیں۔ مگر قاعدہ گڑیا کا گھر ہو گا۔ قاعدے کو گڑیا کے گھر سے کیا نسبت ہو سکتی ہے!

دوسرے روز صبح بھائی نے آواز دی "چلیے آپ کا قاعدہ آگیا"۔ میں تیر کی طرح بھاگی ہوئی برآمدے میں پہنچی۔

— چنانچہ یہ ایک پتلی سی بے رنگ کتاب تھی، جس کے پہلے صفحے پر آم، بکری، پتنگ وغیرہ کی تصویریں بنی تھیں۔

باقاعدہ بسم اللہ کی تقریب ہرگز نہیں ہوئی کس واسطے کہ بسم اللہ، روزہ کشائی، سالگرہ وغیرہ کی رسوم بسلسلۂ تحریک اصلاح معاشرت مدتوں قبل ترک کی جا چکی ہیں۔

لہٰذا اس طویل دریچے میں جس کے باہر سمندر پر سفید پرندے چکر کاٹ رہے تھے اور ڈیوک آف ولنگٹن، لارڈ آرتھر ویلزلے باغ میں، گلہریوں کے تعاقب میں مصروف تھا اور دور سلور جیل میں گولیاں چل رہی تھیں۔ میں دریائے علم میں غوطہ زن ہوئی۔

"کہو بسم اللہ الرحمن الرحیم — شروع کرتا ہوں" مولانا رب نواز نے قاعدے کے پہلے صفحے پر شہادت کی انگلی رکھتے ہوئے ذرا ہل ہل کر کہا "ساتھ نام اللہ کے"۔

---

[1] دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار — خواہاں نہیں لیکن یہ کسی جنس گراں کا

"جی نہیں۔ شروع کرتی ہوں۔" میں نے اعتراض کیا۔

"اچھا اچھا۔ پڑھو بیٹی۔ آگے پڑھو۔"

"شروع کرتی ہوں ساتھ نام اللہ کے۔"

"سارے ملک، خصوصاً بنگال، یو۔ پی اور صوبہ سرحد میں واقعات کی رفتار تیز ہوگئی۔ ہزار ہا ستیہ گرہی جیلوں میں بند تھے۔"

"دہشت پسندوں کی وجہ سے بنگال کی حالت کانگریس کے لیے خصوصیت کے ساتھ زیادہ نازک تھی۔ دہشت پسندی نے ایسی فضا پیدا کر دی تھی جس میں پر امن ڈائریکٹ ایکشن زیادہ دشوار ہوگیا تھا۔ اور حکومت کے شدید ترین جبر و تشدد کا اثر انارکسٹ اور پر امن دونوں تحریکوں پر یکساں پڑ رہا تھا۔ پولیس اور مقامی حکام وہ قوانین اور آرڈی نینس جو دہشت پسندوں کے لیے بنائے گئے تھے۔ کانگریس مزدور اور کسان ورکرز پر بھی لاگو کر رہے تھے۔ جیل کے بلوے روزمرہ کے واقعات تھے۔ جس میں حکام نہتے سیاسی قیدیوں کو مارتے پیٹتے تھے۔"

دہشت پسندی کی مختلف زاویوں سے مذمت کی جا چکی ہے لیکن اس کے ایک ممکن نتیجے سے مجھے خاص طور سے ڈر لگتا ہے اور وہ یہ کہ اس سے سارے ملک میں فرقہ وارانہ تشدد پھیل جانے کا خطرہ ہے جس قوم میں مذہب سے اتنی شدید وابستگی ہو اس قوم کے لیے دہشت پسندی کے تصور کا عادی ہو جانا بے حد خطرناک ہے۔ سیاسی قتل بے حد بری شے ہے۔ لیکن ایک سیاسی دہشت پسند کو سمجھا بجھا کر دوسرے سیاسی راستے دکھائے جا سکتے ہیں۔ مگر مذہب کے نام پر قتل دنیوی اور عالم بالا کے امور سے تعلق رکھتا ہے، اور ان معاملات میں سمجھانے بجھانے یا عقلیت پرستی کا راستہ دکھانے کی کوشش بھی بہت دشوار ہے اور اکثر اوقات ایک سیاسی قتل ایک مابعد الطبیعاتی طریقے سے نیم مذہبی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ آج دہشت پسندوں کو قوم پرستی، فسطائیت، امپریلیسٹ فاشزم کا مقابلہ کر رہی ہے۔"

"جب میں کلکتے سے روانہ ہو رہا تھا تو دو جوان مجھ سے ملنے آئے۔ وہ مجھ سے بے حد خفا تھے کہ

میں ان کی دہشت پسندی کے خلاف پرچار کر رہا ہوں۔ وہ دونوں پیلے، نروس، ذہین چہروں والے نوجوان تھے۔ میری ٹرین کا وقت نزدیک تھا۔ انھوں نے کہا کہ وہ اپنے کام میں میری مداخلت برداشت نہیں کریں گے اور اگر میں باز نہ آیا تو جو حشر انھوں نے دوسروں کا کیا ہے اسی طرح وہ میرا بھی فیصلہ کر دیں گے۔"

"اس رات کلکتے سے روانہ ہوتے ہوئے اور ٹرین میں اپنی برتھ پر لیٹنے کے بعد مجھے ان نوجوانوں کے چہرے دیر تک مضطرب کرتے رہے۔ جوش اور نروس انرجی سے بھرپور یہ لڑکے کیسے غلط راستے پر پڑ گئے تھے۔ مجھے افسوس رہا کہ وقت اتنا کم تھا ورنہ شاید ان سے مفصل بات چیت کر کے ان کو ملک کی خدمت اور حصول آزادی کے دوسرے راستے اختیار کرنے پر مائل کر سکتا۔ ان راستوں پر بھی بہادری اور قربانی کے مواقع کی کمی نہیں۔ پچھلے برسوں میں مجھے اکثر ان کا خیال آتا ہے۔ مجھے ان کے نام کبھی نہ معلوم ہو سکے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ شاید وہ دونوں مر چکے ہوں یا انڈمان کی کسی کوٹھری میں پڑے ہوں۔"[1]

ہندوستان میں ستیہ گرہ جاری ہے۔ انڈمان میں دہشت پسند قیدیوں کی بھوک ہڑتال اور اموات کے خلاف احتجاج کرنے والوں کو ہندوستان بھی قید کر لیا گیا۔ ستمبر ۱۹۳۳ء میں رہائی اور دوبارہ گرفتاری کے درمیان مختصر وقفے میں پنڈت نہرو نے ٹیگور اور سی ایف انڈریوز وغیرہ کے دستخطوں کے ساتھ اپیل شایع کی جس میں انڈمان کے سیاسی قیدیوں کے ساتھ بہتر سلوک اور انھیں ہندوستان کی جیلوں میں منتقل کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ برطانیہ کے ہوم ممبر نے لندن میں اس اپیل پر شدید ناراضگی کا اظہار کیا اور انڈمان کے سیاسی قیدیوں سے اظہار ہمدردی بنگال میں ایک قانونی جرم قرار پایا۔

انڈمان سے واپس آنے کے چند روز بعد ایک صبح بھائی اور میں، والدہ اور ایک رشتے دار مہمان کے ساتھ کہیں جاتے ہوئے ایک اجاڑ سی عمارت کے سامنے سے گزرے تو والدہ نے اچانک کہا "وہ دیکھو سامنے جواہر لعل بیٹھے ہیں۔"

---

[1] سوانح عمری از جواہر لعل نہرو۔ جو جیل میں لکھی گئی اور ۱۹۳۶ء میں شایع ہوئی۔

جواہر لعل نہرو ایک چھوٹے سے سنسان برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھے تھے اور دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھے دور پہاڑوں کو دیکھ رہے تھے۔ سامنے کار رکتی دیکھ کر وہ کرسی سے کھڑے ہو گئے ہیں اور بھائی اتر کر نیچی دیوار کی طرف بھاگے۔ جس کے سامنے مسلح سپاہی ٹہل رہا تھا۔ جواہر لعل نہرو متبسم اور سوچ میں ڈوبے ہوئے چند لمحوں تک ہماری طرف دیکھتے رہے۔ سپاہی ٹہلتا ہوا ہماری سمت آیا۔ ڈرائیور نے ہارن بجایا۔ ہم لوگ کار کی طرف مڑے۔ پنڈت نہرو دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئے کار آگے روانہ ہو گئی۔

"میں ساڑھے چودہ مہینے تک دہرہ دون جیل کی کوٹھری میں رہا۔ مجھے دوسرے جیلوں میں بہتر کوٹھریاں دی گئی تھیں مگر دہرہ دون جیل کی ایک رعایت میرے لیے بیحد قیمتی تھی۔ یہ جیل بہت چھوٹا تھا اور ہم لوگوں کو قید خانے کی فصیل سے باہر لیکن جیل کے احاطے میں اندر ہی ایک مختصری حوالات میں رکھا گیا تھا۔ یہ جگہ اتنی چھوٹی تھی کہ اس میں ٹہلنے یا چلنے پھرنے تک کی گنجائش نہ تھی۔ چنانچہ ہمیں اجازت تھی کہ صبح و شام پھاٹک کے قریب ٹہل لیا کریں۔ یہاں سے ہمیں پہاڑ اور کھیت اور پبلک سڑک جو کچھ فاصلے پر تھی نظر آسکتی تھی۔ یہ رعایت خصوصیت سے میرے لیے نہیں بلکہ سارے 'اے'، اور 'بی'، کلاس قیدیوں کے لیے تھی ــــ صرف وہی انسان جو طویل مدتوں کے لیے اونچی دیواروں کے پیچھے محصور کر دیا گیا ہو اس چہل قدمی اور کھلی فضاؤں کے نظارے کی نفسیاتی قدر و قیمت کا اندازہ کر سکتا ہے۔ مہینوں میں ان پہاڑوں کو جن سے مجھے عشق ہے، دیکھا کیا۔ کوٹھری میں سے مجھے پہاڑ نظر نہ آتے لیکن وہ میرے تصور میں موجود تھے۔ مجھے ان کی قربت کا احساس تھا۔ میرے اور پہاڑوں کے درمیان گہری یگانگت پیدا ہو گئی ــــ دہرہ دون کا موسم گل بے حد خوشگوار ہوتا ہے۔ جاڑے نے درختوں کو پتیوں سے عاری کر دیا۔ جیل کے پھاٹک کے سامنے پیپل کے چار شاندار درخت اپنے پتے گرا چکے تھے کہ اچانک درختوں میں خفیف سی جنبش اور سرسراہٹ پیدا ہوئی اور ایک پر اسرار سی کیفیت اور فضا چاروں طرف چھا گئی۔ گویا پس منظر میں بیحد خفیہ کارروائیاں کی جا رہی ہوں۔ اور پھر نہایت سرعت کے ساتھ لاکھوں نئی نویلی پتیوں نے دھوپ اور ہوا کے جھونکوں سے کھیلنا شروع کر دیا لیکن برسات کے زمانے میں پانی سے بچنے کے لیے تنگ و تاریک کوٹھری

کے ایک کونے میں سکڑا اور سمٹ کر بیٹھنا زیادہ خوشگوار نہیں تھا کیونکہ پانی چھت سے ٹپکتا اور مینہہ کی بوچھار کھڑکیوں سے اندر آتی ۔ موسم خزاں دلآویز تھا اور سرما لیکن جاڑوں میں طوفان اور باد و باراں آگھیرتا اور بڑے بڑے اولے ٹین کی چھت پر گولیوں کی باڑھ کی طرح گرتے تو ایک نسبتاً معقول جگہ ذراسی گرمی اور تھوڑے سے آرام کی خواہش پیدا ہوتی۔ کوٹھری میں ان گنت بھڑیں اور پتنگے تھے۔ چمگادڑیں جو اندھیرا پڑے اڑتیں۔ مجھے ان سے سخت دحشت ہوتی۔ گھنٹوں میں چیونٹیوں، دیمک اور چھپکلیوں، گلہریوں اور کبوتروں کو دیکھا کرتا۔ دہرہ دون جیل میں میناؤں کے ایک جوڑے نے کوٹھری کے دروازے کے اوپر اپنا گھونسلہ بنا لیا تھا۔ میں ان کو دانہ کھلاتا اور اگر ان کے کھانے کے وقت میں صبح و شام ذراسی دیر ہو جاتی تو میرے بالکل قریب آکر پرشور احتجاج کرتے۔ دہرہ دون میں پرندوں کی افراط تھی۔ ہم ان کو دیکھ نہیں سکتے تھے کیونکہ حوالات کے صحن میں درخت نہیں تھے۔ صرف ان کی آوازیں سن سکتے تھے۔ میں ہوا میں بانکپن سے تیرتے ہوئے عقابوں کو دیکھا کرتا۔ اکثر جنگلی بتخوں کی ڈار سر پر سے گزر جاتی ۔ بچھو عموماً اور برسات کے زمانے میں خصوصاً ملک کے مختلف جیلوں میں ہماری کوٹھریوں میں پائے جاتے۔ مجھے تعجب ہے کہ مجھے کسی بچھو نے ڈنک نہیں مارا حالانکہ یہ بچھو مجھے عجیب عجیب اور غیر متوقع جگہوں میں ملتے رہتے تھے۔ بستر پر، کسی کتاب کے اندر، تین چار سانپ بھی مختلف جیلوں میں میری کوٹھریوں کے اندر یا ان کے آس پاس پائے گئے۔ ان میں سے صرف ایک کی خبر باہر نکل گئی تو اخباروں نے جلی سرخیوں میں شایع کی [1]

تاریخ کا ایک پورا دور گذر جانے کے بعد، ۵۳ء میں یا شاید اس سے ذرا قبل کراچی جم خانہ کی ایک دعوت میں ایک الٹرا فیشن ایبل اور عالی شان اور بیحد حسین و جمیل بیگم صاحبہ سے میری ملاقات ہوئی جو کسی بہت زبردست ڈی آئی جی کی دوسری بیوی اس دعوت کی مہمان خصوصی تھیں۔ بیگم صاحبہ نے بے حد بلندی پر سے اور خاصے سرپرستانہ انداز میں مجھ سے دو چار باتیں کیں، مے گلگوں کا خالی گلاس تپائی پر رکھا اور برق تبسم گراتی دوسری طرف

---

[1] سوانح عمری از نہرو

مڑنے لگیں تو میزبان نے نزدیک آتے ہوئے کہا "ارے فرخندہ! یہ کیا۔ تمھارا گلاس تو خالی پڑا ہے!"

"اب نہیں" بیگم صاحب نے ہاتھ اٹھا کر نزاکت سے انکار کیا۔

"ارے بھئی۔ کالا پانی کاٹ چکی ہو اور کالا پانی پینے میں اتنا بخل" میزبان معترض ہوئے۔
اتنے میں بیگم صاحبہ کے ڈی آئی پی شوہر بھی اپنا گلاس تھامے قریب آکر بیٹھ گئے۔

کالے پانی کے نام پر میرے کان کھڑے ہوئے اور میں نے بیگم صاحبہ سے پوچھا "آپ کس زمانے میں تھیں کالے پانی میں؟"

انھوں نے نہایت خوبصورتی سے سنی ان سنی کر دی۔ میں نے دوبارہ دریافت کیا۔
"کس زمانے میں؟"

"زمانے سے آپ کا کیا مطلب ہے؟" بالآخر انھوں نے ذرا تیوری پر بل ڈال کر پوچھا۔
تب دفعتاً مجھے سوجھ گیا اور میں نے بے ساختہ اونچی آواز میں کہا "ارے آپ مولینا۔ مولینا رب نواز کی لڑکی تو نہیں؟"

بیگم صاحبہ جو بہت دیر سے چہک رہی تھیں ایک دم چپ ہوگئیں اور مختصراً اور ذرا خشکی سے کہا "جی ہاں!"

"بھئی حد ہوگئی!" میں نے جگمگاتے ہوئے مجمع کو اس بیوقوفی کے عالم میں مخاطب کیا۔
بھئی یہ تو فرخندہ جمال نکلیں اور ان کے والد مولانا رب نواز اس قدر سولٹ تھے اور ایسے نڈر۔۔ قیدیوں کے سامنے ایسے ایسے وعظ کہتے۔۔۔!"

"قیدیوں کے سامنے وعظ کہتے!" ایک صاحب نے حیرت سے سوال کیا "کہاں؟"

"پورٹ بلیئر میں!" میں نے جواب دیا "خود سرکاری ملازم تھے لیکن ایسے لطیف پیرائے میں ایسی بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ انگریز حکام کھول کر رہ جاتے مگر وہ وعظ اس انداز سے کہتے کہ تھے کہ ان کی کسی بات کو گرفت میں نہ لایا جا سکتا تھا۔ اب مجھے مولینا رب نواز کے متعلق وہ ساری باتیں یاد آتی جا رہی تھیں جو بعد میں ایک مرتبہ والد نے بتائی تھیں۔

مثلاً یہ کہ مولینا ان قدیم وضع کے پٹھانوں میں سے تھے جو کسی بیڈ سے پہلی مرتبہ ملتے ہی زیر لب درود شریف پڑھنے لگتے ہیں۔

"وہ زمانہ بے حد خطرناک تھا" میں نے بات جاری رکھی۔ "ہندوستان میں ٹرسٹ موومنٹ زوروں پر چل رہا تھا۔ انڈامان کے سلور جیل میں روز سیاسی قیدیوں پہ گولیاں چلتی تھیں۔ تیسری گول میز کانفرنس تو ہو چکی تھی، جنے کس سن میں ہوئی تھی، بھئی کمال ہے!"

ڈی آئی جی شوہر کبھی مجھے دیکھتے اور کبھی فرخندہ جمال کو۔ فرخندہ بیگم میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیوں اس قدر مجھ سے خفا نظر آرہی تھیں۔

"مولینا رب نواز ـ" میں نے قریب کے صوفے پر بیٹھے ہوئے ایک با اقتدار نئے سیاست دان کو جو اپنی سیاسی بد دیانتی اور ریشہ دوانیوں کے لیے بہت مشہور رکھتے مخاطب کیا "اس نسل کے فرد تھے جس نے دیوزاد پیدا کیے۔ حالانکہ کوئی ان کا نام نہ تب جانتا تھا اور نہ اب کسی نے ان کا نام سنا ہے۔ وہ ایک فروتن اور غریب عالم اور صحیح معنوں میں مرد مومن تھے۔"

میزبان نے اس دوران میں فرخندہ بیگم کے گلاس میں شراب انڈیل دی تھی۔ فرخندہ بیگم نے ذرا جھجک کر گلاس تپائی پہ رہنے دیا۔ با اقتدار سیاست دان نے پہلو بدل کر سگریٹ جلایا۔ میں فضا کی ان overtones سے قطعی بے خبر ادای سے کہتی رہی۔ مولینا اس قدر سوئٹ تھے۔ آج برسوں بعد اس طرح یاد آگئے تو ایسا عجیب سا لگ رہا ہے۔ وہ مجھے الف بے پڑھاتے تھے۔ بغدادی قاعدہ بھی شروع کروانے والے تھے مگر ہم لوگ انڈامان سے جلد ہی واپس چلے آئے۔ وہ بھی کیا زمانے تھے۔ ہیں نا فرخندہ ـ مولینا کیسے ہیں ان کو ضرور میرا آداب کہیے گا۔ اور آپ کی امی کیسی ہیں۔ ؟ آپ ہی بتائیے ایسا اتفاق روز روز کہاں ہوتا ہے کہ بچپن کے ساتھ کھیلے اس طرح غیر متوقع دوبارہ نظر آجائیں۔ مگر فرخندہ بیگم جلدی سے معذرت چاہ کر اٹھیں اور میزبان کے ساتھ ڈانس فلور پر چلی گئیں۔ دوسرے لمحے ان کے شوہر بھی جو عنقریب ایک مرکزی وزیر بننے والے تھے۔ ایک خاتون کے ساتھ رقص کرنے کے لیے وہاں سے اٹھ گئے۔ جب نامور سیاست داں بھی چند منٹ بعد دوسری طرف چلے گئے تو

نزدیک بیٹھی ہوئی میری ایک ملاقاتی بیگم سراج نے آہستہ سے مجھ سے کہا۔ "تمھاری بیوقوفی کی بھی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ جانتی ہو اس وقت تم نے کیا غضب کیا ہے؟"

"کیا ہوا؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"فرخندہ بیگم کی ابھی ابھی شادی ہوئی ہے۔ ان کی اوفیشل عمر محض بائیس ۲۲ تیئس ۲۳ برس کی ہے اور تم ہو کہ عین ان کے شوہر کے سامنے غدر کے وقتوں کے بڑی بوڑھیوں کی طرح گڑے مردے اکھیڑنے بیٹھ گئیں۔ ہندوستان کا ٹرسٹ موومنٹ — اور گول میز کانفرنس — اور یہ اور وہ — لے کے ان کے شوہر کو بھونچکا کر دیا اور مستقل بیگم صاحبہ سے جرح کیے جا رہی ہو۔ کہ کس زمانے میں تھیں۔ غضب خدا کا — یہ زمانے کی بھی ایک رہی۔"

"اچھا تو یوں کہو۔ اب جا کر میری سمجھ میں آیا ہے۔"

"ان کے والد بے چارے کا بہت عرصہ ہوا انتقال ہو چکا ہے۔"

"ارے!" میں نے رنج سے کہا۔ "اتنے سوئیٹ تھے، مجھے دھندلے دھندلے اب تک یاد ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ مگر آپ اس وی آئی پی مجمع کے سامنے یہ ثابت کرنے کو جٹی ہوئی تھیں کہ فرخندہ بیگم کسی بڑے آدمی کی صاحبزادی ہونے کی بجائے کسی نگوڑے جیل خانے کے سنکی واعظ کی بٹیا ہیں۔"

میں نے ہکا بکا ہو کر بیگم سراج کو دیکھا اور تب مجھ پر پہلی بار اچانک یہ انکشاف ہوا کہ ان لوگوں سے میں کسی دوسری زبان میں بات کر رہی تھی۔

"اینٹیں گرانے میں تمھارا کوئی ثانی نہیں ہے۔" بیگم سراج نے ساری کا پلّو سنبھال کر اٹھتے ہوئے کہا اور مسکراتی ہوئی وہ بھی اپنے پارٹنر کے ساتھ ڈانس فلور پر چلی گئیں۔

دسمبر ۵۹ء میں دلّی کے ورلڈ اگری کلچرل فیئر میں ہندوستان کی ساری ریاستوں کے پویلین طرزِ تعمیر اور آرائش کے لحاظ سے اپنی اپنی تہذیبی روایات کے عکاس تھے — اترپردیش کی عمارت لکھنؤ کے امام باڑوں کی وضع کی بنائی گئی تھی۔ راجستھان اور آندھرا اور بنگال کے پویلین محل، ایلورا اور بانس کے جھونپڑوں کے انداز کے تھے اور وہیں ٹروپیکل پودوں سے گھری

ایک مصنوعی جھیل کے کنارے چوبی کھمبوں پر استادہ ایک بنگلے پر میری نظر پڑی جس کی پیشانی پر "انڈامان ونکوبار" لکھا تھا۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئی۔ اندر دیواروں پر آزادی کے بعد سے جزائر کی صنعتی اور تعلیمی ترقی کے اعداد و شمار کے گراف آویزاں تھے۔ سفید ساریوں میں ملبوس دو بنگالی لڑکیاں ایک کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی تھیں جن پر گھریلو دستکاریوں کے نمونے سجے تھے۔

"یہ سامان سلور جیل کے قیدیوں نے بنایا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"سلور جیل؟" ایک لڑکی نے دہرایا۔ دوسری سیلز گرل اس کے قریب آئی۔

"سلور جیل تو عرصہ ہوا ختم ہو چکا ہے۔ انڈامان اب پینل سیٹلمنٹ نہیں ہے۔ اب وہاں آزاد نئے انڈامانی بستے ہیں" دوسری لڑکی نے کہا۔

"نئے انڈامانی؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں! — مشرقی بنگال سے آئے ہوئے زراعت پیشہ رفیوجیوں کو وہاں بسایا گیا۔ ہم دونوں بھی ایسٹ پاکستان کے رہنے والے ہیں"

"انڈامان سیاحوں کی جنت ہے" پہلی لڑکی نے کہا "کلکتے سے پورٹ بلیر ہفتہ وار فضائی سروس ہے۔ کبھی آئیے!"

"ضرور!" میں نے اخلاق سے جواب دیا اور سامنے دیوار پر لگی آدی واسیوں یعنی جنگلی قبائل کے رقص کی تصویر دیکھنے لگی۔ انڈامانی قبیلے کے اب صرف تئیس افراد باقی ہیں۔ دوسرے قبائل کی تعداد چند سو رہ گئی ہے"

گو قدیم حجری عہد ابھی مہذب انسان کی جبلت میں ابھی تک زندہ ہے مگر تاریک جنگلوں میں اس کے آثار ختم ہو گئے۔

میں دوسری طرف مڑی اور تب اچانک مجھے بارہ بنگلہ کی ایک بہت بڑی تصویر دکھلائی پڑی — بارہ بنگلہ —!! میں ٹھٹھک کر، گم سُم اس تصویر کو دیکھنے لگی۔ بارہ بنگلہ! جس میں اب جزائر کی حکومت کا کوئی اہم دفتر تھا۔ اپنے چوبی کھمبوں پر ایستادہ ثابت و سالم محفوظ سی طرح اپنی پہاڑی پر موجود تھا۔ میں محویت سے اسے دیکھا کی۔ اس کے فرانسیسی دریچوں کے

شیشے اس طرح جھلملانے لگے گویا جواباً وہ مجھے گھور رہے ہوں۔

بارہ بنگلہ کے سامنے ربڑ کے درختوں کا جھنڈ موجود تھا۔ مگر ان کے سائے میں کھیلتا آرتھر ویئر وہاں نہیں تھا۔ حوالدار رام چند اور مولینا رب نواز اور نور محمد اور یہ کاش چند اور بوڑھی ٹیوٹر مسٹر اینڈرسن نہیں تھے۔ ان دریچوں کے نیچے بیٹھ کر والد صبح کا اخبار پڑھتے تھے۔ سمندر کی سفید موجیں اسی طرح باغ کی ڈھلوان سے ٹکرا رہی تھیں، زندگی مجھے معلوم ہوا اسی طرح جاری رہتی ہے۔ وقت بدل جاتا ہے۔ آگے بڑھ جاتا ہے۔

جیولوجیکل وقت میں گھرے انسان کی زندگی چیونٹی کی عمر سے بھی حقیر اور مختصر ہے۔ مگر زندگی جاری رہتی ہے اور آگے بڑھتی ہے۔ وقت بدل جاتا ہے آگے بڑھ جاتا ہے۔

کیونکہ اس لمحے اس تصویر کے سامنے کھڑی میں وہ ہستی نہیں تھی جو ان کمروں، ان برآمدوں اور اس باغ میں کھیلتی اور کودتی پھاندتی تھی منہ پھاڑ کر روتی تھی، کھانے کے میز کے نیچے بلّی کے ساتھ چھپ کر بیٹھ جاتی تھی۔ ایک دوسری قطعاً مختلف ہستی تھی۔

بارہ بنگلہ مجھے گھورتا رہا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ اتنے طویل عرصے کے بعد جو تم میرے سامنے آئی ہو۔ تو مجھے بتاؤ کہ مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہو۔ اتنے عرصے تم نے زندگی میں کیا کیا — ؟ اور مجھے سنانے کے لیے تمھارے پاس کیا ہے ؟

میں جلدی سے کاؤنٹر کی طرف مڑی۔ "نئی انڈا مانی" سیلز گرل نے انناس کے ریشے سے بنا ایک شاپنگ بیگ پیش کیا۔ "واجبی قیمت اور بہت مضبوط!"

اگر میں اس لڑکی کو بتاتی کہ کسی زمانے میں، میں اس دیوار پر آویزاں تصویر کے اندر رہتی تھی۔ تو اسے کتنا عجیب لگتا۔

یہ لڑکی دوسری نسل سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے دکھ دوسرے تھے۔ اس نسل کی قسمت میں جتنے دکھ لکھے تھے سہہ چکی تھی۔ وہ آزاد برصغیر کی Rootless نوجوان پیڑھی کی ایک فرد تھی۔ وہ لوگ جنھوں نے پچھلے پچاس برس تک آزادی کی لڑائی لڑی ان کے قدموں کے نیچے ان کی اپنی دھرتی تھی جس کی پائندگی اور تابندگی کی خاطر وہ لڑے ہیں۔ مگر اسی نئی نسل کے

قدموں کے نیچے سے زمین نکل چکی تھی۔ اس نسل میں رفیوجی تھے اور نئے کلبیت پسند تھے اور ٹیڈی نوجوان تھے۔ منزل پر پہنچ کر منزلیں دھندلا گئی تھیں۔

بارہ بنگلہ کی تصویر نے دوبارہ مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اور اس پر نظر ڈال کر میں نے پھر خود کو یقین دلانا چاہا کہ اس شگفتہ آرٹسٹک پویلین کے اندر موجود ہیں۔ میں ایک مختلف ہستی ہوں۔ بارہ بنگلہ مجھے گھورتا رہا۔

۔ شاید میں اب بھی وہی بیوقوف، حیرت زدہ ہستی تھی۔ جس کے خیال میں سمندر مزدوروں نے کھودا تھا۔ مسٹر اینڈرسن اپنی ٹانگیں علیٰحدہ کر کے گھر پر رکھ جاتے تھے۔ اور قاعدہ گڑیا کا گھر تھا، اور یہ پرانی چوبی عمارت میری اس حقیقت سے واقف تھی۔ اس کی نظروں سے بچنے کے لیے میں تیز تیز قدم رکھتی پویلین سے نیچے اتر آئی۔

نومبر ۱۹۶۱ء کلکتے کے مہاجنی سدن میں للت کلا کیندر کی سالانہ میوزک کانفرنس شروع ہونے میں کچھ دیر تھی۔ بڑے غلام علی خاں، بسم اللہ خاں، مشتاق علی خاں، بیگم اختر، اشتیاق اور دوسرے بڑے فن کاروں کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے باہر سڑک پر ایک بھیڑ جمع ہو چکی تھی لیکن ہال ابھی خالی پڑا تھا۔ میرے ساتھی زینے کے نیچے باتوں میں مصروف تھے۔ میں ٹہلتی ہوئی ہال کے اندر چلی گئی اور ہال کی دیواروں پر آویزاں روغنی تصاویر کی قطاروں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ سارے ہال میں کئی سو تصویریں رہی ہوں گی جن کے نچلے کونوں میں بنگال کے نامور فن کاروں کے دستخط تھے۔ یہ کس قسم کی پورٹریٹ گیلری ہے۔ میں نے ذرا تعجب سے سوچا اور نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی ان تصویروں کے قریب گئی۔

۔ متجسس، بے چین آنکھیں۔ پر سکون آنکھیں۔ اداس تبسم، مطمئن، شانت تبسم، مسرور چہرے، سنجیدہ چہرے، مضطرب اور سوچتے ہوئے چہرے۔ یہ کون لوگ ہیں؟ حیرت کے ساتھ میں نے تصاویر کے نیچے پیتل کی چھوٹی چھوٹی تختیوں پر منقش نام پڑھنے شروع کیے۔

خودی رام باسو   پھانسی ۱۹۰۸ء

پرفلا چکی	جیل میں خودکشی ۱۹۰۸ء
اشفاق اللہ	پھانسی ۱۹۲۹ء
بھگت سنگھ	پھانسی ۱۹۳۱ء
پرتی لتا وادیدا	خودکشی ۱۹۳۲ء
راجندر لہری	پھانسی ۱۹۲۷ء
گوپی ناتھ ساہا	پھانسی ۱۹۲۴ء
جتیش گوہا	پولیس کے مظالم سے مرے ۱۹۳۰ء
دیپ پرشاد گپتا	گولی مار دی گئی
ماتا نگنی ہاجرہ	پولیس کی گولی سے شہید ۱۹۴۲ء
سدھیر کمار بوس	انڈامان میں بھوک ہڑتال سے مرے

— میں ٹھٹھک گئی۔ سدھیر کمار بوس۔ انڈامان میں۔ بھوک ہڑتال سے مرے۔
اچانک میں نے محسوس کیا کہ میرے پیچھے کوئی کھڑا ہے۔

"یہ — یہ میرے بڑے بھائی تھے۔" میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک خستہ حال کھچڑی بالوں والا دبلا پتلا آدمی میرے پیچھے کھڑا مجھ سے کہہ رہا تھا "آپ ان تصویروں کو بڑے دھیان سے دیکھ رہی تھیں۔" اس نے میرے برابر آکے کہنا شروع کیا۔ "آپ تو ان کے نام بھی نوٹ کرتی جا رہی ہیں۔ آپ کیا جرنلسٹ ہیں؟"

"میں شاید آپ کے بھائی کی ایک جھلک دیکھ چکی ہوں۔"

"دادا کو دیکھ چکی ہیں آپ؟ یہ کیسے ممکن ہے؟" اس نے بے حد تعجب سے پوچھا۔

"آ۔ کم آن ہنی (Honey)۔" ایک گورا چٹا ٹیڈی بوائے اپنے بے حد نوکیلے جوتوں پر تیرتا ہوا آکر میرے اور تصویر کے درمیان حائل ہو گیا جہاں سے وہ اپنی گرل فرینڈ کو آواز دے رہا تھا جو ہال کے دوسرے سرے پر شاید اپنی کرسی تلاش کر رہی تھی۔

"ہائی ڈوپ۔ کم آن ہیر۔" لڑکی نے جو بے حد تنگ شلوار اور اس سے بھی زیادہ تنگ

قمیض میں جکڑی ہوئی تھی ٹیڈی بوائے کو جوابا پکارا۔ ٹیڈی بوائے اس طرح نوکیلے جوتوں پر تیرتا آگے نکل گیا۔ اس کی چست سیاہ پتلون کی نازک کمر پر بندھی نقرئی بیلٹ روشنی میں جگمگا رہی تھی۔

مدقوق بنگالی نے پھر مجھ سے بات شروع کی: "میں بھی کرانتی کاری[1] تھا۔ آدھی زندگی جیل میں کاٹی" اس نے اداسی سے کہا "آپ۔ آپ آرٹیکل لکھیں گی۔؟"

"شاید۔ پتہ نہیں"

"میرا نام پربودھ کمار بوس ہے۔ میں باریسال کا رہنے والا ہوں۔ دادا کے انڈمان جانے کے وقت میں اسکول میں تھا۔ دادا کے غم میں روتے روتے میری ماں بھی مرگئی۔ گھر میں اسکول سے نکلتے ہی موومنٹ میں شامل ہوگیا اور جیسور میں پکڑ لیا گیا۔ بارہ برس بیں علی پور جیل میں بند رہا۔ آزادی کے بعد آزادی ملی تب میرا ضلع دوسری طرف جاچکا تھا۔ اب میں۔ اب میں"

ٹیڈی بوائے برق رفتاری سے پھر واپس آیا۔ اب اس کے ساتھ چند امریکن بیٹ نک Beat nik تھے۔ جن میں سے ایک نے سیاہ شیروانی، چوڑی دار پائجامہ اور ایک کلائی میں چاندی کا کڑا پہن رکھا تھا۔ دوسرے امریکن بیٹ نک نے خاکی نیکر پر بنگالی کرتا پہنا ہوا تھا۔ تیسرے امریکن بیٹ نک نے مغربی لباس ہی پر اکتفا کیا تھا۔ مگر وضع قطع سے لڑکی معلوم ہو رہا تھا۔ امریکن بیٹ نک لڑکی حلیے سے لڑکا دکھائی دے رہی تھی۔ یہ سب اسٹیج کے نیچے کھڑے اس انگریز لڑکی کی سمت جارہے تھے جو ہندوستانی رقص سیکھنے کے لیے انگلستان سے آئی ہوئی تھی اور برجو مہاراج کی شاگردی میں کتھک کی مہارت حاصل کرنے کے بعد آج شام اپنے فن کا مظاہرہ کرنے والی تھیں۔ ہندوستانی ٹیڈی بوائے نے مدقوق انقلابی کو بازو کی ایک جنبش کے ساتھ اپنے راستے سے ہٹایا اور اپنے بیٹ نک مہمانوں کے ہمراہ آگے بڑھ گیا۔

عین اسی وقت مارواڑی سیٹھوں، سوسائٹی لیڈیز، پروفیشنل انٹلکچوئیلز اور

---

[1] انقلابی

کلچر ولچرز (Culture vultures) کا ایک ریلا برابر کے دروازے سے ہال میں داخل ہوا اور مدقوق انقلابی اس ریلے میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے اس کی تلاش میں چاروں طرف دیکھا۔ میں اس سے کہنا چاہتی تھی کہ میں اس کے دادا کی کہانی ضرور لکھوں گی۔ میں اس سے کہنا چاہتی تھی کہ میں تو سارے برصغیر کی کہانی جاننا اور لکھنا چاہتی ہوں۔ مگر یہ کہانی سننے اور سنانے کے لیے محض ایک حیاتِ مستعار بیحد ناکافی ہے۔ میں اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا اس کے دادا ہی وہ جوشیلے نوجوان تو نہیں تھے جو غصّے میں بھرے پنڈت جی کے پاس پہنچے تھے۔ مگر وہ گمنام، تباہ حال کرانتی کاری اس زرق برق "بے پردا"، خوش باش، آسودہ حال مجمع میں کہیں کھو چکا تھا۔

اسٹیج پر جل ترنگ بجنا شروع ہو گئی[1]

---

[1] یہ کہانی میں نے پچھلے سال لکھی تھی۔ حال ہی کی خبر ہے کہ چچا محمدی، ایک پرانے انقلابی جن کی پھانسی کی سزا حبسِ دوام میں تبدیل کر دی گئی تھی اور چوبیس برس تک انڈامان میں قید رہے، پچھلے دنوں انھوں نے لاہور میں گمنامی اور شدید مفلسی کے عالم میں انتقال کیا۔



جیلانی بانو

سونا آنگن

دعا کے بعد آنکھیں کھول کر بہو بیگم نے دیکھا کہ دن ڈھل چکا ہے۔

صاف ستھرے آنگن میں سناٹا گونج رہا تھا۔ پھولوں کی کیاریوں پر بہار چھائی ہوئی تھی۔ اور آنگن میں پکی جامنوں کا مینھ سا برس رہا تھا۔

اچانک انھیں بہت پرانے دن یاد آگئے۔ جب ان کے شریر بچے کچی پکی جامنیں چبا ڈالتے تھے۔ پھولوں کی کیاریوں میں کوئی کلی سلامت نہ رہتی تھی۔ اور آنگن میں ہر وقت کاغذ کی کترنیں، پھلوں کے چھلکے اور کیچڑ میں سنی گیندیں لڑھکتی پھرتیں۔

پھر انھوں نے جانماز لپیٹ کر کریمن بابا سے پوچھا کہ دروازے پر کون آیا ہے! دن میں وہ پچاسوں بار چونک کر پوچھا کرتی ہیں کون ہے؟ شروع میں تو کریمن اور اس کی لڑکی شمی بہو بیگم کو پاگل سمجھتے تھے۔ مگر اب وہ بھی عادی ہو گئے۔

آنگن میں انھوں نے جو بڑیاں سکھانے کو رکھی تھیں وہ کوے لے لے کر اڑ رہے تھے، انھوں نے کئی بار ہاتھ ہلا ہلا کر کوؤں کو اڑانا چاہا لیکن کوے بھی جیسے اس گھر کے بڈھے اور بے سہارا مکینوں سے واقف ہو چکے تھے۔

جانماز تہ کر کے جب انھوں نے پاندان کھولا تو کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کریں۔ اس لئے انھوں نے خوامخواہ شمی کو اٹھایا۔

"شمی بٹیا ذرا دیکھنا تو، دروازے پر ڈاکیہ ہے۔"

خطوں کا انتظار ان کی زندگی کا واحد کام تھا۔ کیا پتہ کس دن کس بیٹے کو وہ یاد آجائیں

شمی نے بیٹھے بیٹھے کہہ دیا۔ "بیگم صاحب ڈاکیہ تو چلا گیا۔ اب وکیل صاحب کے ہاں خط دے رہا ہے۔"

"اے تو بیٹی، ذرا پوچھ تو لے کہ ہمارا تو کوئی خط نہیں ہے۔"

شمی جانتی تھی کہ خط ہوتا تو پوسٹ مین لے کر آگے کیوں چلا جاتا۔ مگر ان کا دل رکھنے کے لئے وہ ذرا دیر پھاٹک میں کھڑی ہو کر آگئی۔ اتنی دیر میں بہو بیگم کو یقین ہو گیا کہ خط آیا ہے۔ پندرہ بیس دن ہو گئے کسی نہ کسی کا خط تو آتا ہی ہو گا۔

انھوں نے عینک لگا کر ہاتھ پھیلایا تو شمی بڑی ندامت سے بولی۔

"کوئی خط نہیں آیا۔"

"اچھا" انھوں نے مایوسی کے ساتھ عینک اتار دی اور دھم سے پلنگ پر لیٹ کر اپنے میاں کا انتظار کرنے لگیں جو ڈاکٹر کے ہاں گئے تھے۔ جوانی میں کبھی بچوں نے انھیں اتنی فرصت نہ دی کہ میاں کو ایک کٹورا پانی پلا سکتیں۔ مگر بڑھاپے میں وہ اب پل بھر کو کہیں چلے جاتے تو بہو بیگم نئی نویلی دلہنوں کی طرح بے قرار ہو جاتی تھیں۔

لیکن آج انتظار سے پہلے ہی کھانسنے کی آواز آگئی اور پھر حامد صاحب دواؤں اور انجکشن کے ڈبوں سے لدے پھندے اندر آئے۔ دبلے پتلے، خمیدہ کمر، ہاتھوں میں رعشہ، بلڈ پریشر، دمہ اور اختلاج کے مریض، دنیا کے مرد جوانی میں رنگ رلیاں مناتے ہیں اور بڑھاپے میں شعر و شاعری، الیکشن بازی، کلب یا اور کوئی مشغلہ ڈھونڈھ لیتے ہیں۔ مگر حامد صاحب کی جوانی، بیوی کی فرمائشوں اور بچوں کے تقاضوں میں گذری تھی۔ اس لئے نہ تو انھیں دوست بنانے کی فرصت ملی نہ کسی اور شوق کو پالنے کی۔ اب وہ مجبوراً اپنی ساٹھ برس کی بڈھی بیوی سے عشق کرنے لگے تھے۔ وہ دونوں دن رات اپنے اپنے پلنگوں پر بیٹھے ایک دوسرے کی خاطر تواضع دواؤں سے کئے جاتے تھے اور اپنے بچوں کے تذکرے میں گم رہتے۔

آج بھی آتے ہی حامد صاحب نے پوچھا "کوئی خط آیا؟"

بہو بیگم کا جی نہ چاہا کہ انکار کر دیں۔ لیکن مجبوراً کہنا پڑا۔

انکار سنتے ہی انھوں نے دواؤں کے ڈبے تپائی پر رکھے اور جوتے اتارے بغیر پلنگ پر لیٹ کر ستانے لگے۔

"کسی سے ادھار لے کر وجو کو روپے بھیجنا ہی پڑیں گے۔ وہ بہت ناراض ہے۔ اسی لئے تو خط نہیں لکھتا۔" انھوں نے کروٹ بدل کر اداس لہجے میں کہا۔

"اللہ جانے کیا ضرورت آپڑی ہوگی۔" بہو بیگم نے بھی آنسو پی کر۔ دیوار پہ بیٹھی اس سیٹی بجانے والی چڑیا کو دیکھا جس کی نقل واجد بچپن میں کرتا تھا۔

"اور تم نے بڑی دلہن کے لئے بلاغ کے آم نہیں بھجوائے۔؟"

"ہاں ہاں آم تو بھولانے پارسل کر دیئے تھے۔ مگر صادق میاں نے ٹرانسسٹر کی فرمائش جو کی ہے۔ داماد کی بات ہے۔ کیا ٹال دوگے؟"

حامد صاحب اٹھ کر بیٹھ گئے اور بڑی دیر کی سوچ بچار کے بعد بولے۔

"اب ہم اور علاج نہیں کرائیں گے۔ تم صادق میاں کی فرمائش پوری کر دو۔"

"میں نے رابعہ کے بچے کے لئے ننھے ننھے سے کرتے اور ٹوپیاں سی ہیں وہ بھی اسی کے ساتھ بھیج دوں گی۔" کرتے ٹوپیوں کے ذکر ہی سے ان کے چہرے پر اجالا سا پھیل گیا۔

بہو بیگم تو ان عورتوں میں سے تھیں جو شادی کے دن سے بچوں کا انتظار شروع کر دیتی ہیں۔ انھوں نے پہلی بار اپنے دولھا کی صورت دیکھی تو خوشی کے مارے کھل اٹھیں۔ ہائے بچے کتنے خوبصورت ہوں گے۔ باپ کی طرح سرخ و سفید رنگ۔ یہ بڑی بڑی آنکھیں۔ ان کا بس چلتا تو وہ درجنوں بچے پیدا کر ڈالتیں۔ مگر جانے کیا خرابی ہوئی کہ وہ ساتویں بچے کے بعد ہی ٹھپ ہو گئیں۔

دن رات مرغی کی طرح سب کو پوٹے کے تلے دبائے رکھتیں۔ ان بچوں کے لئے انھیں کتنے ہی ناممکن پہاڑ ڈھانا پڑے۔ سب سے پہلے تو انھیں ایک بڑا سا خوبصورت گھر بنانے کا چاؤ تھا۔ حامد صاحب کے باپ دادا نے تیرے میرے کرائے کے گھروں میں زندگی گزاری تھی۔

انھوں نے تو بیٹے کو گریجویٹ بنا کر ہی اپنی زندگی کا کارنامہ انجام دیا تھا لیکن بہو بیگم بچوں کو کھیرے ککڑیوں کی طرح بڑھتے دیکھتیں تو انھیں نواسوں، پوتوں کو پالنے کی فکر ہونے لگی۔ بہوؤں کو لڑتے دیکھتے اور داما دوں کے مزاج سہنے کے لئے ایک بڑے سے گھر کی ضرورت تھی۔ اس کی خاطر وہ میاں سے چھپا چھپا کر آنے پائیاں جوڑا کرتیں۔ چار لڑکوں کو ولایت بھیجنا اور تین پڑھے لکھے داما دوں کا مول کرنا کوئی ہنسی کھیل تو نہ تھا۔ اگر وہ میاں کی تھوڑی سی کمائی پر قناعت کر کے بیٹھ رہتیں تو شاید ان کے میاں بھی اپنی شعر و شاعری میں غرق رہتے۔ لیکن بیوی کے تقاضوں سے انھوں نے ترقی کی سیڑھیاں طے نہیں کیں بلکہ پھلانگنا پڑیں اور وہ ڈپٹی کمشنر تک بن گئے۔ اس پر بھی بہو بیگم کا دمڑی دمڑی پر دم نکلتا۔ وہ ایک بڑی سی کوٹھی کا ارمان لئے بیٹھی تھیں۔ ہائے کیسی کوٹھی تھی کوتوال صاحب کی۔ چاروں لڑکوں کے علیحدہ علیحدہ حصّے، بیٹوں، داما دوں کے لئے علیحدہ کمرے۔ نواسوں پوتوں کے لئے بڑا سا باغ اور نوکروں کے لئے کوارٹرز۔

بڑا لڑکا راشد خوبصورت اور تیز مزاج تھا۔ بہو بیگم دل ہی دل میں سوچا کرتیں کہ یہ حرامی ضرور ولایت سے میم لائے گا۔ اسی لئے انھوں نے راشد و الاحصہ بالکل انگریزی وضع کا بنوایا تھا۔ منجھلا ماجد ہر وقت ماں کے کولہے سے لگا رہتا۔ ذرا دیر کے لئے وہ کہیں چلی جاتی تھیں تو رو رو کر جان ہلکان کر ڈالتا۔ اسی لئے انھوں نے ماجد کے بیوی بچوں کو بھی اپنے ساتھ رکھنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ ساجد پڑھائی کا دیوانہ تھا۔ حامد صاحب کا خیال تھا کہ وہ پروفیسر بنے گا۔ جبھی تو بہو بیگم نے اس کے کمرے میں بہت سی الماریاں اور ایک شیلف بنوائے تھے۔ البتہ واحد ہمیشہ کا روگی تھا۔ نہ پڑھنے لکھنے کا جوگی تھا، نہ کھیلنے کودنے کا۔ سال کے بارہ مہینوں وہ کسی نہ کسی خوفناک بیماری میں مبتلا پلنگ پر لیٹا کراہے جاتا تھا۔ بہو بیگم سوچتیں جانے مٹ گیا کچھ پڑھے گا بھی یا نہیں۔ وہ خود بہتیری قابل تھیں۔ اسی لئے انھیں بچوں کو لاٹ صاحب بنانے کا بڑا ارمان تھا۔

لیکن لڑکیوں کے اندیشے تارے ڈالتے تھے۔ شافعہ، رافعہ تو خیر صورت کی ہی ایسی تھیں کہ باپ ڈپٹی کمشنر نہ ہوتے تب بھی کوئی نہ کوئی راجے کا بیٹا اڑنے والے گھوڑے پر بیٹھ کر ان کے لئے آہی جاتا۔ مگر ہادیہ کمبخت تو نہ صورت کی تھی نہ سیرت کی۔ دن بھر بہن بھائیوں سے

لڑنا مرنا اور ان کے کھیل بگاڑنا اس کا کام تھا۔ بہو بیگم کانپ کر سوچتیں کہ جانے منحوس کو یہ ہے گھر میں چین بھی ملے گا یا انھیں کے کولہے سے لگی بیٹھی رہے گی۔ ویسے ایک بات تو وہ طے کئے بیٹھی تھیں کہ نہ تو کوئی لڑکا پردیس میں نوکری کرے اور نہ کوئی لڑکی دور بیاہی جائے گی۔

بچوں کی یہ پلٹن رفتہ رفتہ نہایت عقل مند اور سرکش ہونے لگی۔ شافعہ نے باپ کو بحث میں قائل کر کے میوزک اسکول میں داخلہ لے لیا۔ ہادیہ کو تصویریں بنانے کا شوق تھا اور وہ سڑن دیوانی سی صورت بنائے جانے کیا چڑیا کا نٹے کاغذوں پہ اتارا کرتی تھی۔ ماجد اور ساجد نے ابا کے لگوائے ہوئے آم اور امرود کے درخت کٹوا پھینکے اور باغ میں ٹینس کا لان بن گیا۔

حامد صاحب بہت برہم ہوئے۔ مگر بہو بیگم بیٹوں کی اس خودسری پر دل ہی دل میں کھل اٹھیں۔ "اے کرنے دو منحوس کو یہ سارا گھر بار ان ہی کے لئے تو ہے۔" انھوں نے جیسے بیزار ہو کر پنکھا اٹھا لیا تو حامد صاحب بیچارے بھی چپ ہو گئے۔ وہ شوہروں کی اس قوم میں سے تھے جو بڑھاپے میں بیوی کی بازگشت بن جاتے ہیں۔ خصوصاً بچوں کے معاملات سلجھانے میں انھیں اپنی نااہلی اور بیوی کی دانشمندی کا پکا یقین ہو جاتا ہے۔

پھر سدا کے روگی واحد کو جانے کون سی دوا راس آگئی کہ وہ بوتل کے جن کی طرح شائیں شائیں بڑھنے لگا اور ایک دن اس نے ضد شروع کی کہ وہ اسکول کی کرکٹ ٹیم کے ساتھ دہلی جائے گا۔ بہو بیگم تو سنتے ہی حواس باختہ ہو گئیں۔ "اے ہے دلی کوئی یہاں ہے۔ اللہ میاں کے پچھواڑے" حامد صاحب بھی ہچکچائے۔ مگر سوچا کہ ابھی سے اتنا گھبرائے تو بھیج چکے انھیں یورپ ـــ واحد کا گھر سے پاؤں باہر نکالنا تھا کہ سب ہی کے پر لگ گئے۔ آج کوئی کشمیر جا رہا ہے تو کل مدراس۔ شافعہ کو بھی کیرل جانا پڑا۔ بہو بیگم کے دل کو جیسے پنکھے لگ گئے۔ پہلی بار واحد گھر سے باہر گیا تو انھوں نے دو دو دن تک کھانا نہیں کھایا۔ دن رات روتی رہیں۔ مصلے بچھا کر یوں بیٹھ گئیں جیسے واحد دشمنوں کے نرغے میں گھرا ہو۔ آٹھ دن کے بعد وہ گھر آیا تو اماں کی حالت دیکھ کر اس نے خود توبہ کی کہ اب کبھی کہیں نہیں جائے گا۔ لیکن جب راشد ڈاکٹر بن گیا تو اس کے یورپ جانے کا دن آپہنچا۔ ایک نہ دو اکٹھے تین برس۔ بہو بیگم کب تک بھوکی رہتیں۔ کب تک راتوں کو جاگتیں۔ پھر چھ اور بھی تو ضدی کام

چور شیطان تھے جو انھیں ایک منٹ کا چین نہ لینے دیتے تھے۔ جوان بچوں کی ماں بھی کتنی احمق اور صبر والی ہوتی ہے۔ بچوں میں جوں توں عقل آتی گئی۔ وہ ثابت کرتے گئے کہ ان کی ماں کا ہر کام حماقت کا ہوتا ہے خصوصاً لڑکیوں کو تو ماں کی ہر بات مضحکہ خیز لگتی تھی۔ وہ لڑکیوں کی پسند کا کپڑا پہننے لگیں۔ ان کی پسند کا گھر میں کھانا پکتا لیکن جس دن ماجد نے اباکو زیادہ حصہ لینے پر ٹوکا تو بہو بیگم کے دل میں چاندنی سی دمک اٹھی۔ اب تو ان کے بچے اتنے سیانے ہو گئے ہیں کہ ماں باپ کو عقل دیں۔

بہو بیگم کی کائنات گھر کے اندر تھی۔ لیکن دنیا کی لمبائی چوڑائی کا اندازہ انھیں اس دن ہوا جب شافو کو ان کے دیور اپنے بیٹے کے لئے پاکستان لے گئے۔ وہ تو کالے کوسوں اپنی بیٹی کو کبھی نہ بیاہتیں۔ مگر آسمانی نکاح کو کون روک سکتا ہے۔ شافو چلی گئی تو بہو بیگم نے رو رو کر عینک لگالی۔ ان کے بال اچانک سفید ہونے لگے۔ توبہ کی، اب دوسری لڑکیوں کو غیر محلے میں بھی نہ دیں گی۔ شافو نے بھی پہلے تو رو رو کر ہر روز اماں کو ایک خط لکھا۔ لیکن پہلا بچہ ہوا تو وہ اماں کو اطلاع دینا ہی بھول گئی۔ دو برس تک راشد کو بھی اماں کے پکائے ہوئے سالن اور ابا کی صورت بہت یاد آئی اور پھر ایک دن بہت اداس ہو کر اس نے وہیں گھر بسا لیا۔

اس خبر نے بہو بیگم کے دل پر پتھر دے مارا اور حامد صاحب کا بلیڈ پریشر گرنے لگا۔ بچپن میں انھوں نے جانے کتنی بار راشد کے گلابی گال چوم کر اعلان کیا تھا کہ میرا چاند تو ولایت کی میم لائے گا۔ مگر جب وہ دن آیا تو بہو بیگم کو دل کا دورہ پڑ گیا۔ اپنے ہاتھوں سے راشد کے سر سہرا باندھنے اور اس کی سسرال والوں سے جہیز پر لڑنے کا انھیں کتنا ارمان تھا۔

بڑے کی دیکھا دیکھی چھوٹے بھائیوں کے لئے بھی کہیں نہ کہیں جانا ضروری ہو گیا۔ مگر ہادیہ کو انھوں نے بیچ بیچ پڑوس میں دیا۔ لڑکا بچپن سے دیکھا بھالا۔ پھر اتنا قابل۔ لیکن وداعی کے وقت بہو بیگم یوں کلیجہ پھاڑ کے روئیں جیسے بیٹی سات سمندر پار جا رہی ہو۔ وہ جو کہتے ہیں کہ بری بات منہ سے نکالو تو ہو کر رہتی ہے۔ سو وہی ہوا۔ ہادیہ کے دولھا کو بیٹھے بٹھائے جانے کا کیا خفقان اٹھا کہ امریکہ جائے گا۔ سب اس بات کو مذاق ہی میں ٹالتے رہے اور وہ امریکہ چلا گیا — پھر وہ دن بھی آگیا کہ بہو بیگم یوں رو رہی تھیں جیسے ہادیہ سمندر پار جا رہی ہو۔

لوگ انھیں سمجھاتے کہ لڑکیاں شوہروں کے گھر میں اچھی لگتی ہیں اور کبھی لڑکے کھانے کمانے باہر نہ جائیں تو کیا نکھٹو بنے ماں باپ کے ٹکڑوں پر پڑے رہیں۔ ان باتوں کو دس برس بیت چکے تھے۔

بہو بیگم نے چڑیاں پالی تھیں کہ موقع ملتے ہی سب اڑ گئیں۔ وہ سب کبھی کبھار مہمانوں کی طرح دو چار دن کے لئے آ نکلتے تھے۔ ورنہ زندگی کی تیز رفتاری میں انھیں اتنی مہلت نہ ملتی تھی کہ اپنے وطن جاکر بوڑھے ماں باپ کا دل بہلائیں۔

سب اپنی روزی کمانے، اپنے اپنے مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے عہدوں پر کام کر رہے تھے۔ اس لئے ان کی ذمہ داریاں بھی بڑھی ہوئی تھیں۔ کسی کو تعلیم یافتہ ہو کر جاہل اور جھگڑالو ساس کے پاس آنا اچھا نہ لگتا تھا۔ کسی بیٹے کو یہ پرانی وضع کا گھر پسند نہ تھا۔ پھر ابا کے حقے کی بدبو اور کھانسی بلغم کی سڑانڈ اور اماں کی تیز مزاجی سے وہ دور بھاگتے تھے۔

اب اس بھائیں بھائیں کرتے گھر میں وہ اکیلی رہ گئیں۔ ان کا دل تو صرف اپنے میاں کی تنہائی پہ کڑھتا تھا جو تنہائی سے گھبرا کے گھٹتے جا رہے تھے۔ کوئی اتنا بھی تو نہ تھا کہ تھرمامیٹر دیکھ کر ان کا ٹمپریچر پڑھ سکے۔ آئے گئے کی خوشامد کرنا پڑتی۔ کبھی کبھار کوئی بہو کسی بچے کی سالگرہ کا فوٹو بھیج دیتی کہ دادا دادی تحفہ بھیجیں گے۔ بس پھر دونوں بڑھیا بڈھوں کو ہفتوں کا شغل مل جاتا۔ ہر آنے والے کو وہ فوٹو دکھاتے۔ پیار کرتے کرتے بہو بیگم تصویر کو پیک سے رنگ ڈالتی تھیں۔

"راشد کتنا شریر تھا۔ ایک بار یہی ضد تھی کہ میں ہر وقت کھڑی رہوں۔ جہاں بیٹھی اور وہ رویا سارا دن کھڑی رہی تھی۔" بہو بیگم پاندان کھول کر بیٹھتیں کہ پرانے دن سامنے بکھر جاتے۔

"اور ماجد کیسا نڈر، دیوار پر سے صحن میں کود جاتا تھا۔ حامد صاحب آنکھیں چندھیا کر ماجد کا بچپن دیکھنے لگے۔

"ماجد کی ساس کہہ رہی تھیں کہ ماجد کا تیسرا لڑکا بالکل اسی کی صورت ہے۔" بہو بیگم نے چھالیا کاٹتے ہیں بڑے فخر سے کہا۔

"لیکن تصویر میں دیکھو اس کی ناک بالکل ماجد کی سی نہیں ہے۔" حامد صاحب کو فوراً

پرانی تصویریں ڈھونڈ کر دیکھنے کا چانس مل گیا۔

"مجھے تو راشد کا فرمان شہزادہ لگے ہے۔ کیسی پیاری صورت ہے۔" بہو بیگم بے ساختہ مسکرانے لگیں۔

"لیکن کہیں اس کا رنگ اپنی ماں کا سا نہ ہو"، حامد صاحب نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"اے واہ۔ وہ کیوں ہونے لگا کالا۔ میرے بچے کالے ہو ہی نہیں سکتے۔

"میرے بچے۔" حامد صاحب نے ترس کھانے والے انداز میں بیوی کی طرف دیکھا۔ "جب ہمارے بچے ہی ہمارے نہ ہوئے تو ان بچوں سے کیا ناتا۔؟" اس حقیقت کو جاننے کے باوجود وہ خود بھی یہی حماقت کرتے تھے۔ ان بچوں کی یادوں اور باتوں کے سوا ان کے پاس کچھ نہ رہا تھا۔ کبھی کبھار جب کسی بہو کے طعنوں کے زخم سوکھ جاتے تو ان کے پیروں میں پھر چل اٹھتی جانے کی۔ ان کا جی چاہتا اپنے پوتوں سے جا کر کھیلیں۔ انھیں شرارتیں اور گالیاں سکھائیں۔ پھر وہ کسی سے ادھار قرض کر کے چل کھڑے ہوتے۔ لیکن وہاں ان کے ناک تھوک اور پرہیزی غذاؤں سے عاجز آ کر بہو انھیں دوسرے تیسرے دن ٹرین میں سوار کرا دیتی تھی۔

وہ دونوں اپنے اپنے پلنگ پر لیٹے اونگھ رہے تھے۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ مگر کون اٹھ کر روشنی کرتا۔ باہر سڑک پر شام کا ہنگامہ بڑھتا جا رہا تھا اور امامن نے ہنڈیا جلا ڈالی تھی۔ گو بھی جلنے کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔

اتنے میں اذان کی آواز آئی اور وہ دونوں کلمہ پڑھتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔

بہو بیگم نماز کی چوکی پر بیٹھی وضو کر رہی تھیں کہ ان کی بھتیجی رضیہ آ گئی۔ اب ان کا زیادہ وقت ان بھانجیوں بھتیجیوں کے مسائل سلجھانے میں گزرتا تھا۔ مگر آج رضیہ آئی تو ہمیشہ کی طرح قہقہے لگانے کی بجائے آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ آتے ہی ان سے لپٹ کر رونا شروع کر دیا۔ معلوم ہوا کہ رضیہ کے میاں نے دوسرا نکاح کر لیا ہے کیونکہ رضیہ کے بچے نہیں تھے۔

یہ خبر سن کر بہو بیگم نے خود بخود اطمینان کی ایک طویل سانس لی جیسے ساتوں بچے بیک وقت ان کے پیٹ میں چیاؤں چیاؤں کر رہے ہوں۔ پھر انھوں نے اپنے آنسو پونچھ کر رضیہ

کو تسلی دی ہے "اے جنے نگوڑے مارے کی نیت کو کیا ہو گیا۔ بعلاتم سے زیادہ خوبصورت اور محبت کرنے والی کہاں ملے گی حرام خور کو۔"

"مگر پھوپو ان کا بھی کیا قصور ہے؟" رضیہ نے سسکیاں روک کر کہا۔

"میں بانجھ ہوں۔ اللہ نے میرے نصیب ہی کھوٹے کر دیئے ہیں تو وہ کیوں اولاد کے لئے ترسیں۔ گھر کو آباد کرنے والا کوئی تو ہو۔ بڑھاپے میں تو انسان کو صرف اولاد ہی کا سہارا ہوتا ہے۔"

بانجھ ۔۔! بہو بیگم کے سینے پر لفظ موسل بن کر گرا اور رگ رگ کو کچل گیا۔ انھوں نے اپنے بھائیں بھائیں کرتے خالی گھر کو دیکھا اور پھر حامد صاحب کو جو کھانستے کھانستے ڈگمگاتے قدموں سے اٹھ کر پانی پی رہے تھے۔

اچانک بہو بیگم کو ایسا لگا کہ وہ خود بھی بانجھ ہیں۔ ان کی کوکھ سے آج تک کوئی کونپل نہیں پھوٹی۔ انھوں نے اس اندھیرے گھر میں روشنی کرنے والا کوئی بچہ پیدا نہیں کیا۔ پھر اپنی بدنصیبی پر وہ رضیہ سے لپٹ کر یوں روئیں جیسے ان آنسوؤں میں ڈوب مریں گی۔

"رضیہ بیٹی ۔ میری گڑیا۔ صبر کر ۔" پر دل ہی دل میں بولیں "ماں کو دیکھ وہ تو بانجھ سے بھی بدتر ہے۔ دیکھ، دیکھ ۔۔۔"

مہندر ناتھ

آگے دوکان، پیچھے مکان

دلاری کو کسی بات کی کمی نہ تھی۔ ایک اچھا خاصہ گھر۔ بڑا ہی مرنجاں مرنج قسم کا خاوند۔ بیوی کی ہر بات ماننے والا۔ بچارا صبح سے لے کر شام تک دوکان پہ کام کرتا اور جو کچھ کما کر لاتا وہ دلاری کے قدموں میں ڈال دیتا۔ خاوند کی معقول آمدنی کے علاوہ، ایک چاند سا لڑکا بھی تھا۔ گھر میں نہ ساس نہ سسر۔ بس تھوڑی سی بہت خاوند کی سیوا کرنی پڑتی۔ دلاری کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو بے حد خوش رہتی۔ نہ جانے دلاری کے ذہن میں کونسی خلش تھی کہ ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے بھی یہ گھر اس کو کاٹنے کو دوڑتا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا خاوند دبلا پتلا اور کافی بدصورت انسان تھا اور دلاری اپنے گاؤں کی سب سے حسین لڑکی تھی۔ بچپن سے لے کر جوانی تک ہر شخص نے اس کے حسن کی تعریف کی اور اس کی سہیلیاں تو اس کے آگے پیچھے گھومتی تھیں۔ اور ہمیشہ اس کے رنگ روپ کی مدح سرائی کرتیں اور ان کی باتیں سن کر اس کا چہرہ پھول کی طرح کھِل اٹھتا۔ جب کبھی وہ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتی تو گھنٹوں آئینے میں اپنی صورت دیکھتی رہتی۔ موٹی موٹی کالی سیاہ آنکھیں، نوکدار کٹیلے ابرو۔ چھوٹی سی ناک، گلاب کی پتیوں کی طرح نازک اور کومل ہونٹ، سیب کی رنگت کی طرح سرخ سرخ رخسار، صراحی دار گردن، گورا رنگ، درمیانہ قد، ابھرا ہوا سینہ، اور باقی جسم پرکشش اور جاذب نظر کسی کی نگاہ پڑ جائے تو دیکھتا ہی رہ جائے۔

نیلا تو اکثر کہتی تھی "دلاری، تو رانی لگتی ہے، رانی۔ کسی راجے مہاراجے کی نظر تم پر پڑ جائے، تو فوراً تمھیں اپنی رانی بنا لے۔ ہائے رام۔ تو کس بنئے کے پلے پڑ گئی۔ جسے روپے گننے

کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔"

عجیب قسم کا لاابالی پن اس کے ذہن میں تھا۔ آوارگی کی لطیف سی خواہش اس کے دماغ میں کہاں سے آگئی تھی۔ مردوں سے بات کرنے میں اسے بڑا مزا آتا۔ اگر کوئی اس کے حسن کی تعریف کر دیتا تو وہ اس کی بے حد ممنون ہوتی۔

اور یہ بات درست تھی کہ جب سے وہ دولہن بن کر اس گھر میں وارد ہوئی اس کے حسن کو چار چاند لگ گئے تھے۔ محلے والے تو اس کے گن گاتے تھے۔ بوڑھی عورتیں اسے گلے سے لگاتیں اور اس کی درازی عمر کی دعائیں کرتیں۔ بس برج موہن نے اس کی طرف عاشقانہ نگاہوں سے نہ دیکھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی بھینس کو خرید کر لایا تھا۔ بس دو وقت کا چارہ ڈال دیا اور دوکان کی طرف چل دیئے۔

ہائے یہ کندن جیسا بدن، تنگ کمر اور سینے کا ابھار، پھول جیسے رخسار اور پتلے پتلے ہونٹ کس کام کے۔ ان کا کوئی مصرف نہیں یہاں۔ اس چھوٹے سے شہر میں اس کا دم گھٹ کر رہ گیا۔ خود ہی اپنا چہرہ آئینے میں دیکھو، اور خود ہی تعریف کرو۔ ایسے خاوند کا کیا فائدہ، جو اتنا بدذوق ہو کہ اچھی خاصی حسین عورت کا ستیاناس کر دے۔

ایک دن نہا دھو کر جب دلاری اپنے لمبے اور سیاہ بالوں کو سکھا رہی تھی تو کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دلاری نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک پھیری والا کھڑا تھا۔

"کیا ہے؟"

"کپڑے ہیں بہن جی۔"

"یہ کوئی وقت ہے کپڑے دیکھنے کا۔"

"ایک بار میری پسند کے کپڑے دیکھ لیجئے اگر پسند نہ آئیں تو دوبارہ اس گلی میں قدم نہیں رکھوں گا۔ اجازت ہو تو اندر آؤں۔" اس نے اندر آتے ہوئے کہا۔

پھیری والے کی آواز میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ اچھا خاصہ گراں ڈیل جوان تھا۔ چوڑا چکلا

سینہ ، دراز قد، صحت مند بازو، گول چہرہ، موٹے موٹے ہونٹ، بھری ہوئی گردن ، گندمی رنگ، گھنے سیاہ بال ، اور دانت موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

"بہن جی ، اس ساٹن پہ ہاتھ پھیر کر دیکھئے گا۔ ریشم کی طرح ملائم ہے اور اس کا نیم گلابی رنگ آپ کے جسم پر خوب پھبے گا۔"

دلاری ایک اجنبی آدمی کے تعریفی جملے سن کر خوش تو ضرور ہوئی لیکن پھیری والے کی بے باکی پسند نہ آئی بس شرما سی گئی۔

"آپ شرمائیے نہیں - ہر حسن اور شباب پرماتما کی دین ہے - یہ ایسی دولت ہے جو ہر عورت کو نہیں ملتی ۔ میں گاؤں گاؤں اور شہر شہر گھوما ہوں بہن جی، مگر آپ جیسی حسین عورت نہیں دیکھی۔ اسے چاپلوسی نہ سمجھئے گا۔ بس یہ کپڑا رکھ لیجئے گا، بلاؤز کے لئے۔ کسی اچھے درزی سے سلوائیے گا ۔ عام درزی تو کپڑے کا ستیاناس کر دیتے ہیں اور جسم کا حلیہ بگاڑ دیتے ہیں۔ سوٹ کے لئے کپڑا کاٹ دوں ؟"

"کتنے روپیے ؟"

"روپیوں کی بات مجھ سے مت کیجئے۔ جتنے روپے ہوں گے اگلے پھیری میں لے جاؤں گا۔" اس نے کپڑوں کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

جب وہ چلا گیا تو ایک عجیب غنائی سی کیفیت اس کے دل و دماغ پر چھا گئی۔ رخسار اور سرخ ہو گئے خون میں حدت بڑھ گئی۔ کان کی لویں جلنے لگیں اور دلاری اپنے کالے سیاہ بالوں کو گردن میں ڈال کر خوابوں کی بستی میں کھو گئی۔

جب وہ دوبارہ آیا تو اس بار وہ طرح طرح کی چنریاں لایا۔

"جی خوش ہو جائے گا آپ کا یہ چنریاں دیکھ کر۔ یہ دیکھئے نا، سات رنگوں والی چنری، آپ کے جسم پہ یوں لہرائے گی کہ قوس قزح سی کھنچ جائے گی اور یہ آسمانی رنگ کی چنری۔ اللہ قسم ذرا اوڑھ کر تو دیکھئے گا، سارا شہر عش عش کر اٹھے گا اور پھر یہ ہلکے سرخ رنگ کی چنری، اِس کے رنگ

اور آپ کے رنگ میں رتی فرق نہیں۔ شفق کی طرح آپ کے جسم پر چھا جائے گی۔"
دلاری لفظوں کے چکر میں ایسی پھنسی کہ انکار نہ کر سکی۔

"کتنے دام ہوئے؟"

"دام، حضور ہم تو آپ کے غلام ٹھیرے۔ کسی وقت آکر روپے اکٹھے لے جاؤں گا۔ اپنی جیب کی یہ حالت ہے بی بی جی کہ جتنے رہیں گے خرچ ہو جائیں گے۔"

وہ جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

"اپنا نام تو بتا کر جائیے۔" وہ اچانک پوچھ کر خاموش ہو گئی۔

"پریتم۔"

"آپ باتیں خوب کرتے ہیں۔"

"اس ذرہ نوازی کا شکریہ۔ سارا ہندوستان گھوما ہوں۔" اس نے دلاری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی نگاہیں دلاری کی نگاہوں میں جذب ہو کر رہ گئیں۔

اس بار جب پریتم آیا تو ایک نئی ادا سے وارد ہوا۔

"بی بی جی موتیوں والے کی دوکان سے کیا گزرا کہ اچانک میری نظر اس ہار پر پڑ گئی۔ دیکھئے نا اس ہار کو۔ نقلی موتی ہیں لیکن لگتے بالکل اصلی ہیں۔ سوچا، لے چلوں آپ کے لئے۔"

"میں کیا کروں گی اس ہار کو لے کر؟"

"گلے میں پہن کر دیکھئے گا۔ آپ کا حسن دوبالا ہو جائے گا۔"

بڑے بڑے سپید موتی تھے۔ گول گول اور چمکدار۔ بے حد پرکشش اور حسین۔

"ہماری بات مان لیجئے اور گلے میں ڈالئے اس ہار کو۔ آپ کی صندلی گردن اور سینے پر یہ موتی ستاروں کی طرح چمکیں گے۔"

"ہے تو بہت اچھا۔"

"تو پھر رکھ لیجئے۔ کیا سوچ رہی ہیں آپ؟"

"اس کی قیمت؟"

"آپ کو پسند آگیا تو میری محنت ٹھکانے لگی۔ بس مجھے میری محنت کا معاوضہ مل گیا۔ اجازت ہے۔"

"پہلے قیمت بتا کر جائیے۔"

"خوبصورت شے کی کوئی قیمت دے سکتا ہے بی بی جی۔ ہم نے اسی وقت اس کی قیمت وصول کر لی جب آپ نے اسے پسند کر لیا۔ ہمیں روپے کا لالچ نہیں۔ بس گردش میں ہے زمانہ۔ اپنا پاؤں ایک جگہ نہیں ٹکتا کبھی اس گاؤں کبھی اس گاؤں۔ کبھی اس شہر کبھی اس شہر۔ کئی آشیانے بنائے لیکن ہر بار اجڑ گئے۔ ایک آخری آشیانہ بنانے کی آرزو ہے۔" یہ کہہ کر وہ دلاری کی طرف دیکھنے لگا۔

نگاہ پڑتے ہی دلاری سر سے لے کر پاؤں تک کانپ سی گئی۔ ہائے یہ کیسی بے حیا نگاہیں تھیں پریتم کی۔ اس وقت دلاری نے محسوس کیا کہ اس کے جسم کے سارے کپڑے اتر گئے تھے۔ اور ناکردہ گناہوں کے جرم میں وہ عریاں ہو گئی تھی۔

انسان بہت سے فیصلے ایسے بھی کرتا ہے جن کی وجہ شاید وہ خود بھی نہیں جانتا۔

انسان کے لاشعور میں چند خفتہ چنگاریاں دبی دبی سی رہتی ہیں جو کسی وقت شعلۂ جوالہ بن کر بھڑک اٹھتی ہیں اور بنے بنائے آشیانے کو ویرانے میں بدل دیتی ہیں۔ نہ جانے وہ کون سا لمحہ تھا، وہ کون سی منحوس گھڑی تھی، جب دلاری نے اپنے ماضی اور حال کو تہس نہس کر کے اپنے آپ کو پریتم کے حوالے کر دیا۔

اور دلاری کو اس وقت ہوش آیا جب اس نے اپنے آپ کو کلکتے میں پایا۔

چند مہینوں میں اس بات کا پتہ چل گیا کہ یہ خوبرو مرد اس کے دل کا پریتم نہ تھا، بلکہ بڑا ہی عیاش اوباش اور پہنچا ہوا دلال تھا جس کا کام شہر شہر گھوم کر حسین عورتوں کو اغوا کرنا تھا اور انہیں اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر اپنا مطلب نکالنا تھا۔ جب اس کا دل اس قسم کی عورتوں سے سیر ہو جاتا تو وہ انہیں بازارِ حسن کی نذر کر دیتا۔

جب انسان خود غلطی کرے تو پھر شکوہ کس سے کرے۔ دلاری ایسی عورت تو نہ تھی کہ اسے بازار میں کوئی خریدار نہ ملتا۔ لیکن یہ بات واقعی حیرانی کی تھی کہ اس نے کس طرح اپنے آپ کو اس راہ پر لگا لیا۔ کیا اس کے ذہن میں جنسی تلذذ کی کوئی رمق تھی۔ اس نے کس طرح اپنے آپ کو اتنی جلدی بدل لیا۔ وہ کیوں اتنی جلدی شراب گانجا، چرس اور دیگر لوازمات کی رسیا ہو گئی۔ اپنے رنگ روپ پر مرنے والی۔ عیاشی کے چکر میں ایسی پھنسی کہ بڑے بڑوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ جنسی لذت سے لطف اندوز ہونے کے لئے اس نے ایسے بہروپ بھرے کہ کھاجو راہو کے سارے نقشے ماند پڑ گئے۔

جسم پھر جسم ہے، کب تک ساتھ دیتا۔ جوں جوں ماہ و سال گزرنے لگے، اُن کے اثرات جسم پر پڑنے لگے۔ وہ کندن جیسا جسم اپنا حسن و جمال کھو بیٹھا۔ وہ دلکش اور دلفریب محرابیں حسن و عشق کی نذر ہو گئیں۔ اور پھر وہ وقت بھی آگیا جب شباب ڈھلنے لگتا ہے۔ اور روح میں ایک ویرانی سی آجاتی ہے۔

اسی وقت دلاری نے کلکتہ چھوڑ کر بمبئی کا رخ کیا۔

وی۔ ٹی اسٹیشن پر اس کی چھوٹی بہن مل گئی۔

دونوں گلے مل کر خوب روئیں۔

"ہائے۔ تو کہاں چلی گئی تھی بہن۔ ماں تو تیری یاد میں رو رو کر کانٹا ہو گئی۔ اور تو بالکل بوڑھی ہو گئی بہن۔ ترا کندن جیسا جسم۔۔۔۔۔۔"

"مردوں کی نذر ہو گیا بہن" بڑی نے چھوٹی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بہن، ایک منحوس خبر سناؤں؟"

"ایک نہیں، دو سنا سکتی ہو"

"ترا خاوند مر گیا"

دلاری نے اپنی چھوٹی بہن کی طرف دیکھا۔ اور چھوٹی نے سوچا کہ بڑی بہن دھاڑیں مار مار کر روئے گی لیکن دلاری کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ ٹپکا۔

"میں تو اسی دن ان کے لئے مر گئی تھی جس دن میں نے ان کی دہلیز سے باہر قدم رکھا تھا۔"

"جب تک وہ زندہ رہے تمہیں یاد کرتے رہے اور تمہیں یاد کر کے روتے رہے اور رو رو کر

تمھیں یاد کرتے رہے۔"

"بڑے بے وقوف تھے وہ۔"

"ہائے رام، شرم نہیں آتی تمھیں یہ بات کہتے ہوئے۔"

"بیس برسوں کا تجربہ تو یہی کہتا ہے کہ انسان جتنا بڑا ہوتا ہے، اتنا ہی بڑا بے شرم اور بے حیا ہوتا ہے۔ اب تو مجھے گھر لے چل۔"

ماں ملی تو آنکھوں سے آنسوؤں کی گنگا جمنا بہنے لگی۔

"کلنکی تو کہاں بھاگ گئی تھی۔ کس کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ کہاں ہے وہ موا جو تجھے لے اڑا اور تیری جوانی کو ختم کر گیا۔ اس کی صورت تو دکھا۔"

"میں اپنی صورت دکھانے کے قابل نہیں رہی ماں۔"

"دکھانے کو تو ہماری صورت بھی نہیں بیٹی۔ تیری چھوٹی بہن نے یہاں آکر وہ گل کھلائے کہ اب بتاتے ہوئے شرم آتی ہے ——— "دلاری! ہم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ اچھا نہا دھو کر ذرا تازہ دم ہولے بیٹی۔"

چند دن یہاں رہ کر دلاری کو معلوم ہو گیا کہ جو کچھ اس نے پندرہ برسوں میں سیکھا یا گنوایا تھا وہ اس کی چھوٹی بہن نے پانچ برسوں میں سیکھ لیا تھا۔ منہ چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس حمام میں سبھی ننگے تھے۔

مثل مشہور ہے کہ چور چوری کو شاید چھوڑ دے، مگر ہیرا پھیری سے باز نہیں آتا۔ بھلا دلاری اس بڑے شہر میں آکر کیا کرتی۔ یہ ماتما کا جاپ کرنے سے وہ رہی۔ بس زندہ رہنے کی تمنا ضرور تھی۔ اسی چکر میں ایک ایسے شخص سے ملاقات ہو گئی جس نے دلاری کو بوری وی کے اسٹیشن کے قریب ایک کمرہ دے دیا اور دلاری وہیں رہنے لگی۔

اکثر دلاری کے بیٹے ہربنس کے خط ماں کے نام آتے۔ ہربنس اپنی ماں سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ

واقعی چاہتا تھا کہ اپنی ماں کو واپس گھر لے جائے اور اپنے پاس رکھے۔ اس بچاری نے اس دنیا میں کتنے دکھ برداشت کیے تھے۔ اب تو ہربنس اچھا خاصا کماتا تھا۔ باپ کی دوکان کی آمدنی کیا کم تھی۔ ماں آجائے تو چرنوں پہ سر رکھ دوں گا۔

اور جب ہربنس کو معلوم ہوا کہ اس کی ماں واپس آگئی تو وہ خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ وہ خط پڑھتے ہی سیدھا بمبئی پہنچا اور ماں سے ایسے ملا جیسے وہ ہردوار سے گنگا اشنان کر کے آئی تھی۔

ہربنس اپنی بیوی کو بھی ساتھ لایا تھا۔

"بہورانی کیسی ہو؟"

"اچھی ہوں ماں جی،" اس نے ماں کے چرن چھوتے ہوئے کہا۔

ہائے رام سبھی لوگ دلاری کی عزت کرتے ہیں۔ دلاری نے کیا کھویا تھا اور کیا پایا۔ اس کے بارے میں کسی کو کچھ علم نہیں!

کیا دنیا واقعی بدل گئی تھی۔ کوئی اسے گالی نہیں دیتا۔ ماں کو کلنکنی کہہ کر اسے کوئی گھر سے باہر نہیں نکالتا۔ بہو بھی یہ نہیں کہتی کہ میں اس مہان کلنکنی کے پاؤں کیوں چھوؤں۔ یہ کیسی دنیا ہے۔ کیا میں بے غیرت ہوں یا ساری دنیا بے غیرت ہو گئی ہے۔ دلاری نے سوچنا چھوڑ دیا۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو کوڑے مارنے سے کیا فائدہ۔

وہ سب کو بوری ولی لے گئی۔ اپنے بیٹے کو، بہو کو،۔ اور وہاں پہ دلاری کا آخری خریدار بھی موجود تھا۔ دلاری نے سوچا کہ اس کا بیٹا، اس کی بہو اُس کے آخری خریدار کا دیدار کر لیں تو کوئی بری بات نہیں۔

تعارف کے بعد ہربنس سردار حکم سنگھ سے ایسے ملا جیسے دونوں ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے تھے۔

"سردار جی، میں آپ کا بے حد احسان مند ہوں کہ آپ نے میری ماتا جی کو مکان لے کر دیا۔ ہم جہاں ٹھیرے ہوئے ہیں وہ مکان اتنا چھوٹا ہے کہ تیسرے آدمی کے رہنے کی جگہ ہی نہیں۔

سردار حکم سنگھ کی عمر پچاس سال سے اوپر تھی۔ وہ بہو رانی کی طرف دیکھ رہے تھے اور اسے کوکاکولا پیش کر رہے تھے۔

"بیٹا وسکی پیو گے؟" سردار جی نے کہا۔

"لیجئے۔ آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام؟" ہربنس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

وسکی کی بوتل آئی۔ کاگ اڑا اور بہو کے سوا سب پینے لگے۔

"بیٹی، تو بھی پی لے" ساس نے بہو سے پوچھا۔

"پھر کسی وقت ماں جی" بہو نے ذرا شرما کر کہا۔

"سردار حکم سنگھ سے شرمانے کی کوئی بات نہیں۔ وہ تمھارے باپ کے برابر ہیں"

"باپ کے برابر نہیں بیٹی۔ بالکل سولہ آنے باپ ہوں"

"وہ کیسے؟" ہربنس نے پیگ کو ختم کرتے ہوئے کہا۔

"مائی ڈیر سن۔ میں نے تیری ماں سے شادی کی ہے۔ میں تیرا نیا باپ ہوں"

"ڈیڈی۔ ڈیڈی" ہربنس نے اچھل کر پھر سردار جی کو گلے سے لگا لیا۔

"ایک پیگ اور" ہربنس چلایا۔ "ڈیڈی آپ بھی ہمارے ساتھ گاؤں چلئے۔ گاؤں میں ہماری آگے دوکان ہے پیچھے مکان۔ اپنے کھیت ہیں۔ پتاجی بیس ہزار نقد چھوڑ کر مرے ہیں۔ پندرہ ہزار کا بیمہ تھا ان کا۔ جب تک ماں جی نہیں جائیں گی۔ پالیسی کے روپے نہیں ملیں گے۔ کچھ روپے آپ کے پاس ہوں گے ان سب کو ملا کر ہم اچھا خاصہ دھندا کر سکتے ہیں اور مزے سے ساری عمر عیش کریں گے ڈیڈی"

بیٹا نئے باپ کی طرف دیکھنے لگا۔

یہ سب لوگ ایک دوسرے سے ایسے ہل مل گئے تھے، جیسے دلوں میں کوئی میل نہیں۔

یہ سب کچھ دیکھ کر دلاری کی آنکھوں میں پہلی بار آنسو سے آ گئے۔ ہائے رام، سارا زمانہ الٹ گیا۔ نہ کوئی ماں، نہ باپ، نہ بیٹا، نہ بہن بھائی۔ کیا کوئی رشتہ نہیں رہا۔ جس کے پاس کچھ ہوتا ہے اسے کھونے میں مزا آتا ہے۔ یہاں یہ لوگوں کے پاس کھونے کے لئے کچھ نہیں رہا۔ اب پلٹ کر دیکھنے سے کیا فائدہ ــــ؟!

●●●

غیاث احمد گدی

پہیہ

لچھو رانی کی کہانی لکھنا کوئی کھیل نہیں۔ بڑے دل گردوں کا کام ہے۔ پھر بھی جب کل شام رخصت ہوتے وقت اس نے میری طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پُریقین لفظوں میں وعدہ لے لیا تو مجھے ایسا لگا کہ اب بہانہ بازی سے کام نہیں چلے گا۔ اب تو ایک پُرشور دریا کے آگے بندھ باندھنا ہی ہوگا —— یا دوسری صورت میں مجھے شہر چھوڑ کر بھاگ جانا ہوگا۔

دراصل میری سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ میں قصے کا آغاز کہاں سے کروں۔ یعنی میری ساری افسانہ نگاری دھری کی دھری رہ جاتی ہے اور میں اُلّو کی دُم فاختہ نظر آنے لگتا ہوں۔ لچھو کی کہانی لکھنے کے لئے دس بیس سال کے تخلیقی تجربے نہیں، صدیوں کی ریاضت درکار ہے۔ تیرہ برس کی عمر میں شادی شدہ لچھو نے جب دیکھا کہ اُس کا شوہر ہر رات اس کی بجائے دُلاری سے پاؤں دبواتا ہے اور آدھی رات کو اس کو نیچے فرش پر دھکیل کر، لیمپ بجھا دیتا ہے۔ اندھیرے میں صبح دم تک دلاری اس کے پاؤں دابتی رہتی ہے۔ تو ایک دن وہ —— آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر نکل جاتی ہے، اور پھر لوٹ کر خاوند کا منھ نہیں دیکھی۔

"پھر کیا ہوتا ہے لچھو؟"

"لچھو نہیں، لچھو رانی کہو، لچھو رانی......" اُس نے قطع کلام کرتے ہوئے پہلے اپنے نام کی صحت کی طرف متوجہ کیا۔

"اچھا لچھو رانی، پھر تم نے کیا بتایا تھا؟"

پھر لچھو رانی کو الفت یکہ وان مل گیا تھا جس نے بسنجر کے ایک خالی ڈبے میں ایک

گٹھری کے ساتھ اسے بھی گٹھری بنا نیند میں بے خبر پایا تھا۔ اس نے لچھو رانی کو جگایا اور پوچھا کہ کہاں جاؤ گی تو لچھو نے نیند اور سفر کی تھکان سے ٹوٹتے ہوئے جسم کو سیدھا کرتے ہوئے غنودگی کے عالم میں کہا "گھر"

پھر الفت یکہ وان نے مزید کچھ سوال اس لئے نہ کرنا مناسب سمجھا کہ اس کیفیت میں اسے معقول جواب کی قطعی توقع نہ تھی۔ اور یکہ میں بیٹھا کر اپنی جھونپڑی میں ایک بھاری گٹھری کی طرح ٹوٹی جھلنگ چارپائی پر پٹک دیا تو وہ چونکی۔

"ارے مجھے کہاں لے آئے ہو؟"

"گھر" الفت نے اسی سادگی سے کہا اور چولھے کے پاس پہنچ کر آگ جلانے لگا۔

اس کے بعد لچھو نے اور کچھ نہیں پوچھا۔ لچھو کو ایک گھر چاہئے، اور اس کی مختصر سی زندگی میں ـــــ اس کے خاندان کے پچھلے صدیوں کا روایتی تصور بھی یہی تھا۔ ایک چار دیواری ہو، جہاں کوئی ٹوٹی جھلنگ چارپائی ہو نہ ہو۔ ایک چولھا ضرور ہو، اور اس کے بعد اگر کسی چیز کی ضرورت تھی تو بس اس کے گھر والا بھی بغیر گھر والا کے گھر کا تصور نامکمل ہوتا ہے

الفت کی بیوی سال بھر ہوئے اللہ کو پیاری ہوئی تھی۔ الفت کے گھر میں بن گھرنی کے بھوت کا ڈیرہ لگ رہا تھا، ایسے میں نزول رحمت سے فیضیاب نہ ہونا کفران نعمت تھا۔

لچھو رانی اکثر مجھ سے ازدواجی زندگی سے متعلق ایک بہت پرانی گھسی پٹی، مگر حقیقت سے قریب تمثیل پیش کرتی ہے، یعنی، یعنی زندگی ایک گاڑی ہے اور عورت و مرد اس کے دو پہیے .... لہٰذا دونوں پہیوں کا برابر اور متوازی ہونا ازبس ضروری ہے۔ ورنہ قدم قدم پر دھکے ہیں ٹھوکریں ہیں!

چنانچہ چند ہی مہینوں کے بعد لچھو رانی کو یقین ہو گیا کہ یہ جو زندگی کی گاڑی وقت کی سڑک پر اچھلتی کودتی۔ الجھتی پھاندتی بھاگی جا رہی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ سڑک خراب ہے، بلکہ پہیئے کچھ درست نہیں چھوٹے بڑے ہیں اور آپس میں لاگ نہیں کھاتے۔

بقول لچھو رانی کے چند ہی مہینے کے بعد ہر روز وہ اس کی پٹائی کرتا، وہ پٹائی کر

کہ محاورتا نہیں، سچ مچ اسے اپنی نانی یاد آنے لگتی۔ منہ اندھیرے وہ یکّے کو گھر سے نکل جاتا اور رات گئے جب واپس آتا تو شراب کے نشے میں دھت پہلے کھانے کو گوشت روٹی مانگتا۔ جب گوشت کھا چکتا اور روٹی پھینک چکتا تو لچھو رانی کی طرف یوں متوجہ ہوتا گویا دن بھر کا قرضہ اتارنے کا وقت آگیا ہو۔ پھر جب تھک جاتا تو جھلنگ چارپائی پر یوں پڑ جاتا گویا سارے فرائض پورے ہوگئے ہوں۔ ادھر اطمینان سے اس امید میں پٹنے والی لچھو رانی کہ بعد ازاں عام شوہروں کی طرح محبت بھی کریں گے، دیکھتے دیکھتے جب دیکھا کہ کنواں کا پانی ایک دم سے تارا ہوگیا ہے تو سوچتے سوچتے ایک دن وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ ان تلوں میں تیل ہی نہیں رہا۔

اب کھوبڑ سڑک پر چلتے چلتے الفت میاں کے یکّے کا انجر پنجر ڈھیلا ہوگیا ہے اور اب تو خدشہ ہے کہ کسی دن سواریوں کو لئے دیئے دھڑام سے کسی کھڈ میں نہ جا گرے۔

لچھو رانی نے بتایا کہ گدّی جی، بس اسی دن سے میں نے یہ جانا کہ یہ چارپائی پر گہری نیند سویا ہوا الفت یکّے وان جس کے ساتھ میں نے اپنی قسمت جوڑی تھی وہ نرا گوشت کا لوتھڑا ہے گوشت کا لوتھڑا......!

"پھر تم نے کیا کیا لچھو رانی؟"

"پھر میں کیا کرتی، تھوک دیا اُس کے منہ پر اور چلی آئی اس شہر میں....!"

جس شہر میں الفت میاں یکّہ ہانکتا تھا، وہیں اس کا ایک یار رہتا تھا۔ سدّو۔ سدّو اکثر الفت کے ساتھ اس کے گھر آیا کرتا خصوصاً رات کے وقت جب الفت شراب کے نشے میں چور ہوتا وہ یکّے سے اتار کر سہارا دیتے ہوئے اسے چارپائی پہ لٹاتا، گھوڑی کو کھولتا۔ یکّے کو چھپے تلے رکھتا۔ گھوڑی کے سانی لگا دیتا۔ پھر گھنٹہ دو گھنٹہ گھوڑی کو اتنی محبت سے مالش کرتا گویا گھوڑی الفت کی نہیں خود اس کی اپنی ہے۔

مالکانہ احساس کا یہ ارتقاء تھا کہ رفتہ رفتہ اس نے خود لچھو رانی کو اپنی ملکیت سمجھنا شروع کر دیا۔ جس طرح وہ گھوڑی کو سانی لگاتا۔ گاڑی کو چھپے میں رکھتا، چاہتا کہ لچھو رانی کی بھی دیکھ رکھ شروع کر دے۔

بلکہ ایک دن جب لچھو سہ پہر کے وقت چھوٹے سے دھندلے آئینے کی مدد سے ماتھے پر بندیا لگا رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ بندیا ٹھیک جگہ پر نہیں لگ رہی ہے۔

لچھو رانی نے کہا: "تو منہ کیا دیکھتا ہے، لے لگا دے!"

سدو آگے بڑھ کر بندیا لگانے لگا اور دفعتاً اس کے ہاتھ کانپنے لگے اور لچھو رانی نے محسوس کیا کہ بندیا سدّو کے گاؤں والے پیشانی پر ہی نہیں سارے رخسار پر لگاتے ہیں۔

"یہ کیا کر رہا ہے سدّو؟"

"کچھ نہیں رانی بندیا ....." سدو کی آواز حلق میں ٹوٹنے لگی اور وہ سرمستی کے عالم میں اس کی کمر کے گرد اپنے ہاتھ پھیرنے لگا۔

لچھو بولی "میں نے محسوس کیا جیسے کوئی گھمن سانپ میری کمر کے گرد لپٹ گیا ہے۔ ذرا دیر کے لئے تو میں ڈری، پھر پل بھر میں کہاں سے اتنی طاقت آ گئی کہ میں نے سدّو کو ایسا دھکا دیا کہ چکرا کے وہ زمین پر جا گرا۔ تب میں پھرپکی اور چاندی کے کڑے والے ہاتھ سے جو پیٹا، جو پیٹا کہ اس کے حواس ٹھکانے آ گئے۔"

لچھو رانی نے کہا کہ گدّی جی، یہاں تک تو ٹھیک تھا۔ میں اگرچہ اسے پیٹ رہی تھی اور وہ پٹ رہا تھا، مگر مجھے ایک ڈر بھی تھا۔ اکیلا گھر ہے اور سدو پھر بھی مرد ذات ہے۔ مگر جب دیکھا کہ اس نے میرے پاؤں پکڑ لئے اور گھگھیا کہ مجھ سے معافی مانگنے لگا تو میرے ہاتھ رک گئے۔ اب کوئی ایسوں کو کیا مارے۔ اس وقت مجھے بڑی شدید نفرت ہوئی اور میں نے اس کے منہ پر بھی تھوک دیا۔

پھر یوں ہوا کہ لچھو رانی نے جس سدّو کے منہ پر تھوکا تھا۔ اس وقت جب اس کو الفت میاں کے کنلے پن کا احساس ہوا اور ساری دنیا تیرہ و تار دکھائی دینے لگی تو روشنی کا مینار بن کر جو چیز اس کے سامنے آئی وہ سدّو ہی تھا۔

وہ اس رات کے پچھلے پہر جب چاروں طرف ہو کا عالم طاری تھا بلا کھٹکے گھوڑی کے چھپے کے پاس آئی۔ جہاں لید کے پاس ایک میلے ٹاٹ پر دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے سدّو کے شانے پر ہاتھ رکھا اور دھیرے سے جگایا۔ سدو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور

اس کے پاؤں پکڑ کر گھگھیانے لگا۔

"نہیں نہیں لچھو، اب نہیں۔ اب تو مجھے معاف کر دے۔ بہت دن ہو گئے اب تو بخش دے۔"

لچھو رانی کو یوں لگا کہ پھر اس کے منہ پر تھوک دے۔ مگر اندھیرے کنوئیں میں یہی ایک رسی تھی جسے تھام کر وہ باہر آ سکتی تھی۔ تو گدری جی، چار برس میرے ساتھ رہتے ہوئے بھی وہ میرا خاوند نہ رہ سکا۔ اس سے مجھے بچہ بھی ہوا یعنی میری زندگی کے پیڑ میں پھل بھی لگا مگر میں نے برابر یہی سمجھا کیا کہ سدو میرا مرد نہیں میری جورو ہے۔ میری بیوی اور میں اس کا مرد ہوں، جو دن بھر پان کی دکان میں کتھے چونے کا تماشا لگا کر پیسہ بناتی ہوں۔ بازار سے سودا سلف لاتی ہوں۔ اپنے اور سدو کے لئے کپڑے خرید کر لاتی ہوں اور وہ بے چارا دن بھر شریف عورتوں کی طرح کھانا بناتا ہے۔ کپڑے صاف کرتا ہے، مسالہ پیستا ہے اور کسی کسی دن جب میرا بدن بہت ٹوٹتا ہے تو وہ مالش بھی کرتا ہے۔

یہاں پہنچ کر لچھو رانی شرما جاتی اور آنچل سے منہ ڈھک کر ہنسنے لگتی۔

میں کہتا "ساری کہانی میں لچھو رانی یوں تو تم ہر جگہ اپنے عورت پنے کا پتہ چھوڑتی آئی ہو، مگر ظاہری طور پر نہیں عورت دکھائی دیتی ہو۔ اپنے دیس کی عورت....؟"

"کیا اپنے دیس میں عورتیں میرے جیسی نہیں ہوتی ہیں کیا۔ کیا اس کی دو ٹانگیں دو ہاتھ، ناک، آنکھیں......نہیں ہوتیں.....؟"

"ہوتی تو ہیں! مگر کوئی عورت تمہاری طرح اپنے شوہر کا شوہر نہیں ہوتی اور اپنے شوہر سے بدن نہیں دبواتی۔"

"تو میں کیا کروں۔ وہ نکھٹو ہے بھی ویسا ہی۔"

پھر میں اچانک ایک الگ سوال کر بیٹھتا ہوں "جو کچھ بھی سہی پر تم اس کے ساتھ خوش تو ہو؟"

لچھو رانی اس سوال کو سن کر کچھ دیر خاموش رہتی ہے۔ پھر لمبی سانس لے کر میری طرف عجیب نظروں سے دیکھتی ہے، "پتہ نہیں جی، پر ایسا لگتا ہے جیسے مجھے کچھ اور چاہئے۔"

بس یہی وہ مقام ہے جہاں میرا قلم رک جاتا ہے اور اپنے آپ میں یوں الجھ جاتا ہوں جیسے گھنے جنگل میں کھو گیا ہوں۔ لچھو رانی کی گرہستی کی گاڑی بڑے مزے میں چلی جارہی ہے۔ سڑک بھی ہموار ہے اور دونوں پہیے بھی چھوٹے بڑے نہیں۔ صرف اتنی سی چوک رہ گئی ہے غالباً کہ دائیں طرف بایاں پہیہ لگ گیا ہے اور بائیں طرف داہنا...... مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے بظاہر اس جگہ پہنچ کر کہانی مکمل ہو جاتی ہے۔ یعنی راجہ اور رانی مزے سے رہنے لگے ہیں۔ قصہ ختم اور پیسہ ہضم......

اگرچہ یہاں تک سوچنے کے بعد میں بظاہر افسانے کو اختتام تک پہنچا دیتا ہوں۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس تخیّل طرازی میں مجھ سے کہیں بھول ضرور ہوئی ہے۔ کچھ چھوٹ رہا ہے۔ کوئی کمی پڑ رہی ہے۔ گویا اس گہری زندگی میں کہیں کوئی موڑ آنا چاہئے۔ کوئی واقعہ، کوئی حادثہ...... کوئی۔

چنانچہ میں لچھو رانی پان والی کی کہانی نہیں لکھ پاتا۔ میرے قلم کو، میری روح کو، لچھو رانی کی زندگی سے متعلق کسی انوکھے حادثے کا انتظار ہے، یہ حادثہ کب وقوع پذیر ہوگا کن حالات میں ہوگا، پھر اس سے لچھو کی یکسانیت سے بہنے والی زندگی پر اور بعد ازاں میرے افسانے پر کیا ردعمل ہوگا، کیسا ہوگا...... کیسے ہوگا......

میں چند ہفتوں کے لئے آفس کے کام سے باہر چلا گیا۔ کام کی کثرت اور نئے لوگوں کے جھمیلے میں لچھو رانی اور اس کا افسانہ، زندگی تو کیا میں اپنے آپ کو بھول سا گیا۔ چند ہفتے گزارنے کے بعد جب میں واپس لوٹا تو رات مجھے ملیریا بخار نے آدبوچا۔ اکیلے گھر میں بخار اور درد کی شدت کے باعث ساری رات اور سارا دن میں نے خود فراموشی کے عالم میں گزار دیا۔ شام ہوتے ہوتے بخار ذرا کم ہوا تو سرہانے لچھو رانی کو پنکھا جھلتے ہوئے پایا۔

"میں نے صبح سویرے تالا کھلا ہوا دیکھا تو معلوم ہوا کہ تم آ گئے ہو...... ذرا دن چڑھے تو تم خود آؤ گے سگریٹ لینے۔ پاٹ دیکھتے دیکھتے دوپہر ہونے کو آئی۔ بند دروازہ کھلا ہی نہیں تو میرے من میں شک ہوا۔ دیکھا تو سچ مچ تم مردہ سے پڑے ہو۔"

میں نے اٹھنا چاہا تو اس نے کندھوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "نہیں نہیں، اٹھو نہیں ڈاکٹر نے آرام کرنے کا مشورہ دیا ہے۔"

"ڈاکٹر کیسے آیا؟" میں نے گردن گھما کر اس کے چہرے کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ "کیا تم لائیں؟"

"نہیں جی، ادھر سے گذر رہا تھا تو میں نے کہا، اندر چل کر دیکھ لو۔" لچھو رانی نے یوں کہا گویا اپنے آپ کو پس پردہ رکھنا چاہتی ہو۔

دس دنوں تک لچھو رانی نے میری بڑی خدمت کی۔ سارا سارا دن پنکھا جھلتی، ٹھنڈے پانی کی پٹی چڑھاتی، دودھ اور ساگودانہ بنا کر دیتی اور ان سب سے بڑا کام یہ کرتی کہ تنہائی اور اجنبیت کے احساس کو دور دور تک بھٹکنے نہ دیتی۔ بلکہ راتوں کو جب کبھی میری نیند ٹوٹتی تو محسوس ہوتا گویا لچھو ابھی ابھی یہاں سے اٹھ کر گئی ہے یا باہر دروازے پر بیٹھی اونگھ رہی ہے

"یہ تم کیا کرتی ہو لچھو؟ تمھاری دکان اور خراب ہوتی ہوگی اور سدو کی کمر کام سے دوہری ہو جاتی ہو گی!"

"سدو کو میں نے مار بھگایا۔" لچھو رانی نے بڑے اطمینان سے کہا۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

"آئیں ـ"، میں نے محسوس کیا جیسے لچھو رانی کی گرہستی کی گاڑی دھڑام سے کھڈ میں گر پڑی ہو، میں نے پلٹ کر پھر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بدستور مطمئن تھا۔

"یہ کیسے ہوا؟"

"ہوا، تم اچھے ہو جاؤ تو بتاؤں گی۔"

لچھو رانی کے لہجے کی طمانیت سے میں بھی مطمئن ہو گیا۔ مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "پاؤں نہیں دبائے ہوں گے بیچارے نے۔"

"نہیں، یہ بات نہیں۔ اس موئے کی قسمت ہی میں پاؤں دابنے لکھے تھے۔ مرد نام کی تو اس میں چیز ہی نہ تھی، میری دکان میں پان کھانے وہ پٹھان آتا تھا نا، بڑی بڑی مونچھوں والا؟"

لچھو رانی کی دکان میں بڑی بڑی مونچھوں والا پٹھان پان کھانے کے علاوہ کچھ اور امید

میں بھی آتا تھا۔لچھورانی محسوس بھی کرتی تھی۔ مگر اتنا بھی نہیں سوچتی۔جوان آدمی ہے۔ دل لگی کرلیتا ہے۔

مگر ایک روز شام کے جھٹپٹے میں جب دکان میں اور کوئی گاہک نہ تھا اور لچھورانی گوبر مٹی سے سامنے والا فرش پوت رہی تھی۔ پٹھان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ باتوں بات میں نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی اس کی لچھو کو توقع نہ تھی۔ اس نے سنبھالا لیا اور زور سے ایک جھٹکا مار کر پٹھان کے ہاتھ سے اپنا بازو چھڑا لیا۔ اس نے پاس پڑی ہوئی جھاڑو اٹھالی اور ڈپٹ کر بولی۔

"خبردار، جو آگے بڑھے"۔

مگر وہ پٹھان تاؤ میں تھا۔ اس نے لپک کر پھر کلائی پکڑلی اور لگا جھنجھوڑنے۔ لچھورانی مدافعت کم کر رہی تھی۔ مگر سڑک پر راہگیروں کی طرح صرف بیچ بچاؤ کی کوشش میں جتا ہوا تھا۔

لچھو رانی نے بتایا گدی جی! تب میں نے گالی دے دی اور للکارا کہ پاس پڑی ہوئی لوہے کی چھڑ سے دے ایک —— مگر یہ سن کر تو اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے، کانپتے ہاتھوں سے اس نے چھڑ اٹھایا تو ٹھیک، مگر اسی وقت پٹھان نے اسے ایک لات رسید کی اور وہ دور جا گرا۔

پھر ارے باپ رے باپ کہتا ہوا جھونپڑی میں گھس گیا جیسے لچھو کا اس سے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔ وہ تو خیر سے راہگیروں نے پٹھان کو مار بھگایا، ورنہ پتہ نہیں اس دن کیا قیامت گزرتی ....

قیامت تو اس دن گزری جس دن لچھو میرے برتن مانجھ رہی تھی، اور میں صحن میں کرسی پر بیٹھا کہانی لکھ رہا تھا۔ لچھو نے راکھ بھرے ہاتھ کی پشت سے ماتھے پر آئی ہوئی بالوں کی لٹ کو اوپر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"یہ گھر بھی کتنا سونا سونا لگتا ہے۔ تم شادی کرلو"۔

"شادی تو میری ہوچکی۔ لچھو تم تو جانتی ہو!"

"پر بیگم جی، یہاں رہتی تو نہیں کیا فائدہ اس شادی کا!"

میں نے کاغذ سے نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ گویا میرے حالات سے کافی متاثر تھی۔

"اب دیکھو نا، تم اتنا بیمار پڑے۔ کوئی دیکھنے سننے والا نہ تھا۔ اگر تم کو کچھ ہو جاتا تو؟"

"کچھ نہیں ہونے کا۔ ہم کہانی لکھنے والے بڑے بے حیا ہوتے ہیں، پھر تم جو تھیں۔ کتنا خیال رکھا ہے میرا تم نے۔ تم نہ ہوتیں تو شاید میں اب تک مر کھپ گیا ہوتا......!"

اس نے پلٹ کر کہا "خدا نہ کرے...... تم جگ جگ جیو جی......!"

اس کے پلٹ کر دیکھنے میں، اس کے لہجے میں، الفاظ میں کوئی رمز تھا، کوئی راز تھا، یہ عام انسانی جذبے سے کچھ اوپر کی چیز تھا۔ مگر میں سمجھ نہ سکا۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا مجھے چھو کے گزر گیا۔ جھنجھوڑ نہ سکا۔

تیسرے دن وہ میرے یہاں آئی اور میری کتابیں سجاتے ہوئے بولی: "جانتے ہو جی لوگ کیا باتیں بناتے ہیں...... کہتے ہیں...... کہتے ہیں...... وہ رک گئی۔

"کیا کہتے ہیں لوگ؟" میں کہانی کے نقطۂ عروج پر پہنچ چکا تھا۔

"کچھ نہیں جی، تم نہیں سمجھو گے"

"اچھا" میں نے بے خیالی میں کہا اور افسانوں کی دنیا میں کھو گیا۔

پھر ایک روز شام کے وقت جب چراغ جل چکے تھے اور رم جھم بارش کے باعث فضا بہت خوشگوار ہو رہی تھی۔ لچھو رانی ایک نہایت خوبصورت ساڑی میں ملبوس چہرے پر پاؤڈر لگائے، مخموری چال چل کر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"کیا بات ہے، آج بہت خوش دکھ رہی ہو؟"

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے!"

"کیا فیصلہ کر لیا ہے؟" میں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ آج لچھو رانی مجھے کچھ اجنبی اجنبی سی دکھائی دے رہی تھی۔

"کچھ نہیں ــ" اس نے ہڑبڑا کر اپنے آپ کو سنبھالا "میں نے یہ سوچا ہے، آج سے میں آپ کے یہاں سو یا بھی کروں۔ دن بھر تو ایک طرح سے رہتی ہی ہوں"

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے لچھو رانی......؟"

"کیوں؟ کاہے نہیں ہو سکتا۔ میں تمہارا کھانا بنا سکتی ہوں، جھاڑو دے سکتی ہوں۔ برتن مانجھ سکتی ہوں، بستر تک لگا سکتی ہوں تو پھر یہ کیسے نہیں ہو سکتا؟"

لچھو کی منطق میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ پھر میں نے پلٹ کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس کے فیصلہ کن انداز دیکھ کر اور بھی دنگ رہ گیا۔

"مگر......مگر..."

"مگر کیا؟" وہ میری بوکھلاہٹ کا تماشہ مسکرا مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔ "نہیں بھائی میں تو اب یہاں سے ٹلنے والی نہیں۔ کل صبح تک سارے ضروری سامان لے آؤں گی...."

"لیکن، کل تو میں مہینہ بھر کے لئے باہر جا رہا ہوں!"

"کوئی بات نہیں ہے۔" وہ قطع کلام کرتے ہوئے اطمینان سے بولی۔ "تب تو یہاں میرا رہنا اور ضروری ہے۔ آخر گھر کی دیکھ بھال کون کرے گا، تمہارے پیچھے جانتے ہو آج کل کتنی چوریاں ہو رہی ہیں......"

مناسب یہی معلوم ہوا کہ میں فی الحال خاموش رہوں۔ میں نے ایک صندوق میں ضروری سامان رکھے اور چلنے کے لئے اٹھ کھڑا ہو گیا۔

"ارے ابھی سے، جاؤ گے تو کل ہی نا؟"

"نہیں مجھے آج ہی جانا پڑے گا۔" میں نے جیب سے کنجی نکال کر اس کے آگے پھینکتے ہوئے کہا۔ "مہینہ بھر بعد آؤں گا۔"

اس کے بعد میں نے اس رات تو ایک دوست کے یہاں قیام کیا۔ دوسرے ہی دن شہر کے دوسرے رخ تقریباً تین میل کے فاصلے پر ایک مکان کرایہ پر لے کر ٹک گیا۔

بہت دن ہو گئے۔ غالباً چھ مہینے گزر گئے۔ لچھو رانی تا حال میرے ذہن پر کنکھجورے کی طرح قبضہ جمائے ہوئے تھی۔

ایک روز میں بزاز کی دکانوں کے قریب سے گزر رہا تھا ایک کھلی ہوئی فٹن سے کسی نے مجھے آواز دی۔ پلٹ کر دیکھا تو فٹن میں ایک برقعہ پوش عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ میں ادھر ادھر

دیکھنے لگا۔

"یں ہوں گدی جی، لچھو رانی......"

لچھو رانی! یکایک میرا دل دھک سے ہو گیا۔ مجھے محسوس ہوا گویا میری اپنی زندگی کی گاڑی کھڈ میں گر پڑی۔ لچھو نے نقاب الٹ دی اور کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی۔

"ڈرو مت جی، میں نے شادی کر لی۔"

"شادی کر لی لچھو!" میں نے کچھ ندامت، کچھ اطمینان و مسرت سے کہا۔

اس کے چہرے پر بڑا گہرا میک اپ تھا۔ سُرخی پاؤڈر، ہونٹوں پر گہری سرخ لپ اسٹک اس کے جسم سے خوشبو پھوٹ رہی تھی اور مسرت سے اس کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں۔

"خوش تو ہو لچھو رانی؟"

"بہت" وہ گویا میرے سوال کی منتظر تھی "میرا خاوند مرد ہے، بزدل نہیں، ڈرپوک نہیں، اتی بڑی چھاتی ہے اس کی، گدی جی۔ بھگیڑو نہیں!"

مجھے معلوم تھا، یہ سارے تیر کا نشانہ میں ہی تھا۔ میں نے بے حیائی سے ہنستے ہوئے کہا "ہم کہانیاں لکھنے والے بڑے بزدل، بڑے کمزور ہوتے ہیں لچھو۔ تمھاری گاڑی کا پہیہ تو......؟"

"کہا نا بہت مضبوط ہے......" اس نے برجستہ کہا اور نقاب چہرے پر الٹ لی۔ "وہ آ رہے ہیں، تم جاؤ۔"

میں گاڑی سے الگ ہٹ گیا۔ ایک بزاز کی دکان سے کپڑے کا پیکٹ لئے ہوئے لمبا تڑنگا سرخ پٹھان جھومتا جھامتا فٹن کی طرف آ رہا تھا......

لچھو رانی کی زندگی کی گاڑی کو دوسرا پہیہ مل گیا۔ مضبوط بھی اور غالباً موزوں بھی...

پھر بھی میں اس کی کہانی لکھنے سے معذور ہوں۔ میری روح کو اطمینان نہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی چیز گھٹ رہی ہے، کوئی واقعہ، کوئی حادثہ، کوئی اور موڑ......!

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

بنجر زمین

معراج دین عرف ماجھا کسرتی جوان تھا۔ اچھا گٹھا ہوا جسم، کھلتا ہوا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں۔ موٹی سی گردن پہ ذرا ذرا مڑے مڑے پہلوانوں کے سے کان، اچھا خوش مزاج سا نوجوان تھا۔ باپ مر چکا تھا۔ بھائی نے باپ کا کاروبار سنبھال رکھا تھا۔ وہ صبح سے شام تک پرانے کپڑوں کی دوکان پہ بیٹھتا اور یہ پہلوانی کرتا رہتا۔ ماں نے بار بار سمجھایا "بیٹا بھائی دکان پہ اکیلا ہوتا ہے، اس بے چارے پہ کام کا بڑا بوجھ ہے، روٹی کھانے کے لیے بھی بچارا گھر نہیں آسکتا تم ذرا اس کا ہاتھ بٹا دیا کرو۔ بے کار رہنے میں آخر کیا مزا ہے؟"

"ماں اس پہ اور بھی تو بڑے بوجھ ہیں" اور ماں نے سمجھ لیا کہ اس کا اشارہ بھائی کے بیوی بچوں کی طرف تھا۔ اس کے بھائی کی شادی کو دس سال ہو چکے تھے اور ان دس سالوں میں آٹھ بچے ہوئے تھے جن میں چھ زندہ تھے۔ اور یوں اس بے چارے کو دوکان پہ نہیں گھر پہ بھی کوئی فرصت اور آرام کا لمحہ نصیب نہ ہوتا تھا۔ اس بات پہ ماجھا بڑا ترس کھاتا تھا اور کبھی کبھی آرام سے اکتا کر یا اسی ترس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ اس کے بچوں کو سیر کے لیے لے جاتا، گھماتا، پھراتا، ان کی خاطر خدمت کرتا۔ پکوڑے، برفی، پان جو بھی وہ فرمائش کرتے انھیں کھلاتا اور بچے چچا کے ساتھ سیر کر کے جب واپس ہوتے تو بے تحاشا خوش ہوتے اور اکثر اس کے ساتھ سیر کے لیے جانے کی فرمائش کرتے رہتے۔ ادھر وہ ایک آدھ ہی دن کے بعد اس سے اکتا جاتا اور سوچتا۔ اس کے بھائی کا بھی کیا جگرا ہے کہ یہ سب برداشت کیے جاتا ہے اور جب ماں اس سے شکایت کرتی کہ اس کا بھائی کھانا کھانے کے لیے بھی گھر نہیں آسکتا تو وہ کبھی کبھی کہہ دیتا کہ ماں وہ گھر آکر کھانا آرام

سے کیسے کھا سکتا ہے۔ وہاں تو دو پھر بھی گاہک کو ٹھہرا کر، اسے واپس کر کے دروازہ بند کر کے کھا سکتا ہے۔ یہاں اس کے لیے ایسا کیوں کر ممکن ہے، تو وہ اس کا مطلب سمجھتے ہوئے کہتی۔

"ارے بے وقوف تجھے کیا پتہ، جو مزا بال بچوں میں بیٹھ کر کھانے کا ہے۔ لاکھ بے آرامی ہو اس میں بھی بڑا سکھ ہے، تیرے بیوی بچے ہوں گے تو تجھ سے پوچھوں گی۔"

"اللہ نہ کرے۔"

"کیوں برے لفظ منہ سے نکالتا ہے، کالے منہ والا!"

"منہ تو کالا نہیں ماں۔"

"تو کوئی کام کاج کرنے لگے تو تیرے لیے چاندسی بہو لاؤں۔"

"چھوڑ ماں، تجھے تو ایک ہی بات آتی ہے، شادی، بہو بچے!"

"یہ بات تو کبھی نہیں سمجھ سکے گا۔ تو ماں کبھی نہیں ہو سکتا، اولاد کی خوشیوں کا باپ کو بھی درمیان ہوتا ہے۔ مگر جو لگن اس بات میں ماں کو ہوتی ہے وہ مرد ذات کو کہاں نصیب؟"

ماں بیٹوں میں بس یہی بحث، یہی نوک جھوک ہوتی رہتی۔ مگر اس نے کبھی ماں کو ٹھوک سے جواب نہ دیا تھا اور نہ ہی کبھی اس معاملے پہ سنجیدگی سے سوچا تھا۔ اسے تو بس ورزش کا شوق تھا۔ پہلوانی کا، کشتی چلانے کا، دریا پہ جا کے تیرنے کا یا پھر دوستوں کے ساتھ کھیل تماشے کا لیکن کب تک

ایک ایک کر کے اس کے دوست بیاہے جانے لگے۔ اب وہ ورزش میں بے قاعدہ ہو گئے۔ سیر سپاٹے میں کبھی کبھار ہی شریک ہوتے۔ وہ بے فکری کی باتیں بھی بدل گئیں۔ کوئی گھر کے جھگڑے سناتا، کوئی اپنے ہی قصے اور بچوں والے تو کچھ ایسے مصروف ہو گئے کہ مدتیں ہو جاتیں اور کبھی محفل جمتی بھی تو فرصت کم اور موضوع محدود ہوتے گئے۔ بیوی بچوں کا ذکر ہوتا یا رشتے داروں کا۔ جس کو تو آٹے دال کا بھاؤ بھی معلوم ہونے لگا تھا۔ جو کبھی آموں کا ٹوکریوں کے حساب سے ناپ کرتے تھے اور دریا میں ڈال کر صبح سے شام تک آم چوسنے کا پروگرام بناتے تھے۔ اب مٹی کے تیل، دال، آٹا، جوتے کپڑے کے حساب میں کھوئے رہتے اور آموں کے

لیے ان کی جیب کم ہی اجازت دیتی ۔ جب آموں کا ذکر آتا مہنگائی کی بات درمیان میں آجاتی ۔

جب دوستوں کا ساتھ کم ہوگیا تو اسے بھی تنہائی کا احساس ہونے لگا ۔ دوستوں کے ساتھ تو وہ خیر وقت گزار سکتا تھا ۔ مگر آوارہ پھرنا اسے پسند نہ تھا ۔ اب وہ زیادہ وقت گھر پہ رہنے لگا ۔ صبح ورزش کے بعد گھر آجاتا اور لیٹ رہتا ۔ ماں اسے ناشتہ کراتی اور پھر وہ سودا سلف خریدنے چلا جاتا ۔ وہ سودا لینے جاتا تو کوئی نہ کوئی بھتیجی بھتیجا ساتھ ہو لیتا ۔ وہ ہاتھ میں ٹوکری اور رومال لیے بھتیجے کو انگلی سے لگائے یا بھتیجی کو کندھے سے لگائے بازار جاتا ۔ دکانداروں سے گپ لڑاتا ۔ بچے کو برفی لے کر دیتا اور کافی دیر سے گھر پہنچتا ۔

گوشت والا کہتا " ماجھے سودا ہی ڈھونا ہے تو اپنی گھر والی کا ڈھوؤ " سبزی والا کہتا ——" یار بچے ہی کھلانے ہیں تو اپنے تو ہوں نہ " اور مٹھائی والا اکثر کہتا " اپنی اولاد مٹھائی سے بھی زیادہ شیریں ہوتی ہے " اور پھل والا اولاد کو دنیا کا شیریں اور لذیذ ترین پھل کہتا ۔ اور جب وہ گھر واپس آتا تو اس کے منہ کا مزا پھیکا ہو چکا ہوتا اور وہ بڑی بے دلی سے لیٹا سوچتا اب کیا کرے ، وقت کیسے کاٹے —— مصروف رہنے کے لیے اس نے آخر کام کرنے کا فیصلہ کر لیا ، اس نے بھائی کے ساتھ مل کر کام کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ۔ ماں سمجھی کہ وہ سیدھے رستے پہ آگیا ہے ، بڑی خوشی ہوئی ۔

" میں نہ کہتی تھی میرا بیٹا نکما نہیں ، نکھٹو نہیں ہے ۔ وہ جب کام کرے گا تو دنوں میں سالوں کی کمی پوری کرے گا ۔"

اسے اپنے سے یہ امید تو نہ تھی کہ وہ سالوں کی کمی دنوں میں پوری کرے گا ۔ وہ تو بس مصروف رہنا چاہتا تھا ۔ اب وہ معمول کے مطابق جسم کی ورزش سے فارغ ہو کر گھر کا سودا سلف لاتا اور سیدھا دکان پہ چلا جاتا ۔

بھائی کے پرانے کپڑوں کی دکان تھی ۔ وہ بھی بھائی کا ہاتھ بٹاتا بلکہ یہ کہنا چاہیے جلد ہی اس نے کام سنبھال لیا ۔ وہ جس مستعدی اور جس ہشیاری سے کام کرتا تھا اس نے دکان

کی قسمت ہی بدل دی، سارے بازار کے گاہک وہ کھینچ رہا تھا۔ اب تو گویا وہ دکان چلا رہا تھا اور اس کا بھائی اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔

کچھ ہی دنوں بعد بھائی کے آرام کے پیش نظر وہ صبح صبح دکان پر آنے لگا۔ خود آ کر دکان کھولتا۔ سامان لگاتا اور بھائی گھر کا کام کاج نپٹا کر دکان پر آتا اور پھر دوپہر کو کھانا کھانے کے لیے گھر جاتا اور معراج دین دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھاتا۔ کبھی اس کا بھائی سراج عرف ساجھا اسے کہتا بھی ”ماجھے یار تم صبح صبح دکان پر آجاتے ہو، دوپہر کو چلے جایا کرو میں یہاں ہی کھانا کھا لیا کروں گا، ماں کھانے پہ اکثر تمھارا انتظار کرتی ہے۔“

”کوئی بات نہیں بھاجی، آپ بیوی بچوں میں بیٹھ کر کھا سکتے ہیں۔ میرا کیا ہے، یہاں کھا لیا، وہاں کھا لیا ایک ہی بات ہے۔ اور ماں تو ایسے ہی کرتی ہے۔ پہلے کب گھر ٹکتا تھا— یہاں کھانا کھا لیتا ہوں، کوئی گاہک آتا ہے تو اس سے گپ بھی لڑا لیتا ہوں، روٹی کی صلاح بھی لے لیتا ہوں— اور کبھی کبھی اس بے تکلفی سے ایسا متاثر ہوتا ہے کہ ضروری سودا خرید لیتا ہے۔

مگر کچھ دن بعد اس نے دیکھا کہ ساجھا اسے گھر بھیجنے پر مصر تھا اور پھر خود ہی دکان کھولنے پر بضد، وہ حیران تھا کہ آخر اس کی وجہ کیا تھی، اس نے تو بھائی کا ہاتھ بٹایا تھا، اس کا بوجھ ہلکا کیا تھا، اسے آرام دینے کی غرض سے کیا تھا جو کچھ کیا تھا وہ اس کا شکر گزار ہونے کی بجائے اس سے کچھ کھچا کھچا کیوں تھا، اور پھر اس نے بھائی سے کچھ مانگا بھی تو نہ تھا، اسے کوئی اور لالچ ہی نہ تھا۔ وہ تو بس مصروف رہنے کے لیے دکانداری کرتا تھا۔

اور اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اس کی وجہ بازار کے دکاندار تھے جو اس کے بھائی کو سمجھاتے رہتے تھے کہ ماجھا آہستہ آہستہ دکان پر قابض ہو جائے گا، سب کچھ سمیٹ لے گا، اسی لیے اپنا اثر رسوخ جھاڑ رہا ہے، نام ہنار رہا ہے— یا پھر کسی حد تک اس کی ماں اس کی ذمہ دار تھی جس نے اس سے پوچھے بنا از خود اس کے بھائی سے کہنا شروع کر دیا۔

”اب ماجھے کی شادی کرنی ہے، اس کی کمائی علیحدہ جمع کرنی چاہیئے، آخر وہ سارا دن محنت کرتا ہے۔ وہ خود نہیں مانگتا مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اس کا حق بھی اسے نہ دیا جائے۔“

جب اس نے بھائی کا رویہ بدلا ہوا دیکھا تو اسے سخت مایوسی ہوئی۔

"بھائی جان کیا آپ نہیں چاہتے کہ میں آپ کا ہاتھ بٹاؤں؟"

"یہ ہاتھ بٹانا ہے؟ تم بازار میں یوں اپنا سکہ جما رہے ہو جیسے اس دکان کے مالک ہی تم ہو!"

"نہیں بھاجی! آپ کو غلطی ہوئی ہے، ایسی تو کوئی بات نہیں"

"ہے کیوں نہیں، یہ سب دکاندار کیا کہتے ہیں اور پھر ماں کو کس نے کہا کہ ماجھے کی کمائی علیحدہ — !"

"حرامی ہو جس نے ماں سے یہ کہا ہو، بھاجی ایمان سے میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی اور آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو لیجئے آپ سنبھالیے اپنا کام، میں چلا"

اور اس نے سچ مچ دکان چھوڑ دی اور پھر سارا سارا دن گھر پڑا رہنے لگا۔ اب گھر میں سے اور بھی وحشت ہونے لگی تھی۔ دل میلا ہو گیا تھا۔ بچوں سے پیار کرتے ہوئے بھی اسے خیال گزرتا جب بھائی اپنا نہ ہوا تو ان کا کیا اعتبار۔

اس کی ویرانی اور پریشانی دیکھ کر ماں نے کہا "ماجھے تو اپنی دکان کر لے، سارا بازار تجھے جانتا ہے، دنوں میں بن جائے گا"

"نہیں ماں میں بھاجی کے بازار میں اپنی دکان کھولنا نہیں چاہتا۔ میں ان کے کاروبار کی لائن میں کام ہی نہیں کروں گا۔ وہ یہ سمجھیں ماجھا ان کا مقابلہ کر رہا ہے، ماجھا حرامدا نہیں ماں"

"مقابلے کا کیا بیٹا، سب کو اللہ دینے والا ہے"

"پھر بھی ماں، میں اس بازار میں دکان نہیں کروں گا"

اور اس نے سچ مچ ماں کے کہنے کے باوجود وہاں دکان نہ کی، اپنے لیے نیا کام ڈھونڈ لیا، بالکل نیا کاروبار — اس نے پرانے لوہے کا کام شروع کر دیا۔

محنتی تھا، یہاں بھی کام چل نکلا۔

ماں اسے قدم قدم پر موقع بے موقع کہتی رہتی "بیٹا اب شادی کر لو، میں بوڑھی

ہوں، کب تک جیوں گی، تم اپنے کاروبار والے ہو گئے ہو۔ گھر بار والے ہو جاؤ تو اطمینان سے مر سکوں گی۔"

"جتنی دیر میں شادی نہ کروں تو مرنے کا نہیں سوچے گی۔ تو ماں اس شرط پہ میں ساری عمر شادی نہ کرنے کا عہد کرتا ہوں ـــــ اپنا تو جی ہی نہیں چاہتا یہ جنجال پالنے کو، آزاد پھر رہیں۔"

"وقت گزر جائے گا تو پھر سوچے گا تو نے غلطی کی، ابھی سے تو دوستوں کی کمی محسوس کرنے لگا ہے، وقت گزرنے پہ بالکل تنہا رہ جائے گا تو سمجھ آجائے گی۔ پیسہ بھی ہوگا تو کیا ہے کار، بیوی سے بہتر ساتھی کون ہو سکتا ہے؟"

کون بہتر ساتھی ہو سکتا ہے یہ تو اس کو معلوم نہ تھا لیکن اسے بھی اب کبھی کبھی اپنے اکیلے پن کا خیال آنے لگتا تھا۔ خاص طور سے جب سے اس کا دل بھائی کی طرف سے کھٹا ہوا تھا۔ وہ تو سمجھے بیٹھا تھا اس گھر میں بھائی کی بیوی اور بچوں کے ہوتے ہوئے کوئی کمی نہ تھی مگر اس دکان کے واقعے نے اس سے وہ ماحول اور وہ یقین بھی چھین لیا۔

اُدھر ماں کے تقاضے بڑھنے لگے، اِدھر وہ کچھ نرم پڑنے لگا، وہ اسے نت نئے رشتے بتاتی۔ فلاں کی لڑکی ہے، بڑے اچھے کھاتے پیتے ہیں۔ فلاں لڑکی ہے اپنی برادری کی، بڑی خوبصورت ہے ـــــ فلاں ـــــ میری دیکھی بھالی لڑکی ہے، میرے ہاتھوں میں جوان ہوئی ہے ـــــ فلاں لڑکی ما جھے مجھے یوں لگتا ہے تیرے لیے بنی ہے۔"

اور وہ ہر بار اسے ٹال دیتا۔ آخر ایک بار جب وہ خود کو کچھ زیادہ ہی اکیلا محسوس کر رہا تھا ماں کا حربہ کارگر ہوا، ماں نے اپنے کسی غریب رشتہ دار کی لڑکی کی بات چھیڑی، وہ خاموش رہا۔ "لڑکی اچھی ہے مگر غریب لوگ ہیں ـــــ" ماں نے کہا۔

"تو کیا ہوا ماں؟ اپنا کاروبار اچھا ہے۔ ہم نے دولت تھوڑا ہی بیاہنی ہے۔"

اور اس کی ماں پھولی نہ سمائی۔

"بیٹے غریب سہی مگر لڑکی تیرے لائق ہے۔ اتنی اچھی، اتنی صحت مند، ایسی ہنس مکھ جہاں بیٹھے وہ جگہ سج جائے، بچے تمھارے اتنے اچھے ہوں گے۔"

"پنڈ پیا نہیں تے"۔

"چل نالائق ابھی سے ہمیں اچکوں میں شمار کرنے لگا ہے"۔

"نہیں ماں، اجی لوگوں کو مول سے زیادہ بیاج پیارا ہوتا ہے"۔

"یہ بات تو ہے، دادیوں، پھوپھیوں کو پوچھ کر دیکھو! پھوپھی تو خیر ان کی کہاں، میں تو ہوں، میں چاہتی ہوں اپنے ہاتھوں ان کو کھلاؤں، گود لیے پھروں۔ پھر وہ مجھے صحن میں چہکتے نظر آئیں"۔

"کیا شیخ چلی والی باتیں کرتی ہو ماں؟"

"شیخ چلی کیوں بیٹا۔ وقت گزرتے دیر لگتی ہے کوئی، یہ بس عید کے مہینے بیاہ کر دوں گی۔ اللہ خیر رکھے۔ وہ دن اب دور نہیں!"

—— اور ماں رات دن اپنی باتوں اور اپنی تیاریوں میں دکھائی دیتی۔ کپڑے اچھے سے اچھے لائے جا رہے تھے۔ نئے نئے ڈیزائن سلوائے جا رہے ہیں، گوٹا کناری لگ رہا ہے۔ خوبصورت نمونے کے زیورات گھڑوائے جا رہے ہیں۔ دن رات بہو کا چرچا ہے

"وہ تو جس گھر میں قدم رکھے گی وہ جگمگا اٹھے گا، اتنی خوش مزاج ہے کہ ۔۔"

اور کبھی ساجھے کی بیوی کے واسطے سے یوں گفتگو ہوتی کہ وہ کہتی ہے میرے لیے تو اتنا کچھ نہ ہوا تھا۔ یہ کوئی انوکھی بیوی آ رہی ہے —— لو بہن یہ بھی کوئی بات ہے، ہر کسی کا اپنا اپنا نصیبہ، اور پھر وقت وقت کی بات بھی تو ہے، خیر سے ماجھے کی کمائی، اس کی اپنی کمائی لگ رہی ہے۔ ابھی اگلے دن نیلام میں گیا تھا کراچی، تین بھائیوالوں (حصہ داروں) نے مل کر پانچ لاکھ کا سودا کیا ہے، عیش کرے گی، میں کہتی ہوں قسمت کھل گئی اس کی۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جب ماجھا بیوی بیاہ کر گھر لے آیا، اس دن ماجھا بھی خوش تھا، باجے کا بھائی بھی، بھابھی بھی اور اس کی ماں کی خوشی کا تو ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ وہ تو اڑی پھرتی تھی، زمین پہ اس کا قدم ہی نہ ٹکتا تھا۔

چند دن تو اسی طرح گزر گئے، کبھی آنا کبھی جانا، کبھی سسرال اور کبھی اپنے گھر۔ کچھ دن بعد جب وہ ٹک کر اپنے گھر رہنے لگے تو ایک دن اس کی ماں نے باتوں باتوں میں کہا،

"عورت کو زیادہ سر نہیں چڑھانا چاہیئے!"

ماں کے منہ سے یہ لفظ سن کر وہ حیران رہ گیا۔ اس نے جواب میں کچھ نہ کہا، خاموش ہو رہا اور خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا جہاں اس کی بیوی تھی۔

"کیا ہوا، کیوں واپس آ گئے؟ کچھ بھول گئے۔"

"بھولا تو کچھ نہیں" وہ تھوڑی دیر ادھر ادھر بے کار دیکھتا رہا۔ اس کے کمرے میں ان کی تمام چیزیں پھیلی پڑی تھیں۔ ان کے پلنگ، صندوق، جہیز کی الماری، میز، کرسیاں، برتن سبھی چیزیں اور ان سب میں سب سے ممتاز، زندگی سے بھرپور صحت مند، جوان، ذرا ذرا سی سانولی سکینہ۔

وہ اٹھ کر اس کے پاس آئی، اس کی طرف متفکر ہو کر دیکھا۔

"خیر تو ہے!"

"ہاں خیر ہے، ماں سے تم نے کچھ کہا ہے۔"

"نہیں، میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا! کیا کہا ہے انھوں نے!"

"جو کچھ انھوں نے کہا ہے میری سمجھ میں تو نہیں آیا۔!"

"میں بھی تو سنوں!"

"بس یوں ہی کہنے لگیں۔ عورت کو زیادہ سر نہیں چڑھانا چاہیئے۔"

"ٹھیک ہی تو کہا ہے انھوں نے، کوئی غلط کہا ہے۔" سکینہ نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا، اس کی آنکھوں میں چمک تھی، اس نے دونوں بازو پھیلا کر اسے آغوش میں سمیٹ لیا اور اس کے بھرے بھرے ہونٹوں پہ اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ اور پھر کمرے سے باہر چلا گیا۔

جب وہ کمرے سے باہر نکلا تو اس نے دیکھا ماں کی نظریں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔

اور پھر اسے گھر بھر کی نظریں تعاقب کرتی ہوئی نظر آتی رہیں۔ ای کا نہیں، سکینہ کا بھی یہ ،ہیں تعاقب کرتیں۔ اس کو اس تعاقب سے بچانے کے لیے وہ اکثر اس کے ساتھ رہتا، رات کو غسل خانے جاتے وقت وہ اس کے ساتھ ہوتا تو دن کو باورچی خانے میں ساتھ ساتھ ہوتا۔

"میں آپ کو کمرے میں کھانا پہنچا دوں گی" سکینہ آہستہ سے کہتی "نہیں سکینہ تمہارے

پاس بیٹھ کر کھاؤں گا۔ گرم گرم روٹی زیادہ مزا دیتی ہے اور پھر تمھیں پکاتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں!"

"وہاں بھی خود ہی پکا کر دوں گی ـــــ اور دیکھو تو پکاتی تو میں اسی طرح ہوں جس طرح اور لوگ۔"

"اچھا میں چلا جاتا ہوں، اگر تم اکیلی یہاں بیٹھنا پسند کرتی ہو!"

"نہیں آپ سمجھے نہیں، یہ بات نہیں، میں تو یہ چاہتی ہوں کہ ـــــ!" ادھر سے گزرتی ہوئی ایک آواز ان تک آئی۔

"آدھا دن ہو جاتا ہے صبح کے ناشتے پر، دکان پہ کام کیا ہوگا، نوکروں پہ جب کام چھوڑا جائے گا تو خاک کام ہوگا!"

اور وہ جلد جلد ناشتہ کر کے دکان کی طرف بھاگ جاتا۔

"دیوانہ ہوا جاتا ہے لڑکا تو۔"

"مجنوں بن گیا ہے۔"

"ایسا بھی کیا، ہم بھی تو ـــ"

اس قسم کی آوازیں اسے اپنے ارد گرد سنائی دیتی رہیں اور وہ دل میں کڑھتا رہا۔

"ما جھے تیری تو صورت ہی اب نظر نہیں آتی۔" اس کی ماں کہتی۔

"پہلے میں کب تمھاری آنکھوں کے سامنے ہوتا تھا۔" وہ دل ہی دل میں کہتا۔ "سارا دن دوستوں میں گزار دیتا تھا۔ رات تک گھر سے باہر رہتا تھا تب تو کبھی گلہ نہ کیا تھا۔ اب کیسا گلہ، شکوہ اب تو وہ بہت سا وقت گھر پہ ہوتا تھا۔"

مگر وہ یہ سب ماں سے نہ کہتا۔ وہ اس کے گلے کا مطلب سمجھتا اور کھسیانی سی ہنس کر خاموش ہو جاتا۔

"نہیں ماں، ایسا تو نہیں!"

وقت گزرتا گیا، اب باتیں کچھ اور رنگ اختیار کرتی گئیں۔

"ماجھے تو کمزور ہو رہا ہے، خیر تو ہے ؟"

"نہیں ماں کچھ نہیں، بس ورزش چھوڑی ہوئی ہے، میں نہ کہتا تھا۔"

"میں نے یہ تھوڑا ہی کہا ہے ـــــ تو مجھے فکر مند سا نظر آتا ہے۔"

"نہیں ماں! تیرا وہم ہے!"

"تیرا وہم! ارے میں تیری ماں ہوں، سب سمجھتی ہوں۔ سال ہونے کو آیا ہے شادی کو اور وہ ویسی پھرتی ہے!"

"پھر کیا ہوا ماں۔"

"ہوا ہی کچھ نہیں، میں کہتی تھی تیرا گھر بس گیا کل کو تیرے بچے بہلاؤں گی۔"

"تو ابھی کونسی صدیاں گزر گئی ہیں!"

"وہ بھی گزر جائیں گی۔ یہ بات تو شروع ہی میں معلوم ہو جاتی ہے۔"

اور پھر اس نے دیکھا کہ ماں سکینہ کو کبھی کہیں لے جا رہی ہے۔ کبھی کسی دائی کو دکھا رہی ہے۔ کبھی کسی ہسپتال میں لے جا رہی ہے ـــــ اور وہاں سے ہٹی تو کبھی اس درگاہ پہ کبھی اس خانقاہ پہ دعائیں مانگی جا رہی ہیں، چڑھاوے چڑھائے جا رہے ہیں، منتیں مانی جا رہی ہیں، تعویذ لائے جا رہے ہیں، کوئی تعویذ کمرے گرد باندھا گیا، کوئی بازو پہ اور کوئی گھول کر پلایا جا رہا ہے۔

"یہ سب بے کار ہے سکینہ!"

"ماجھے تم تو جانتے ہی ہو، میں ماں کو ناں تھوڑا ہی کہہ سکتی ہوں، کاغذ گھول کر پلا رہی ہے، پی رہی ہوں۔"

"تم انکار کر دو، تم کہہ کیوں نہیں دیتیں!"

"نہیں ایسا تو نہیں کرنا چاہیے مجھے، میں ان کو انکار کیسے کر سکتی ہوں ـــــ اور پھر اس میں میرا حرج بھی کیا ہے!"

"تم نہیں کہہ سکتیں تو میں کہہ دوں گا، یہ مجھے ہی کہنا ہوگا!"

"ناں ناں خدا کے لیے ایسا نہ کرنا۔"

"عجیب ہو تم بھی ! اچھا !"

اور اس کے کہنے سننے پہ وہ بھی خاموش سو رہتا۔

وقت گزرتا گیا، سکینہ کی قدر گھر میں گھٹتی گئی۔ ماجھے کے سوا اسے سب حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ شاید اسی کا اثر تھا یا گھر کے روز افزوں کام کا۔ اب سارے گھر کا کام اسی کے ذمّے تھا۔ روٹی، ہانڈی، برتن کپڑے اور اس پہ نئی مصروفیت۔ وہ بھینس جو بچّوں کے دودھ پینے کے لیے گھر میں باندھ لی گئی تھی) اس کی صحت گھٹنے لگی۔ اس کا بھرا بھرا جسم ڈھلنے لگا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں کی چمک ماندسی ہو گئی اور اس کی جلد کا لہو بھرا صحت مند سانولا رنگ زرد سا ہو گیا۔

"سکینہ، تم کمزور ہو رہی ہو، تمھیں طاقت کی دوائیاں لا دوں ڈاکٹر صاحب سے پوچھ کر، تم کچھ دیر آرام بھی کر و تو بہتر ہے !"

"ہیں، میں کمزور کہاں ہوں ؟ میں تو اب بھی پلا ہوا سانڈ ہوں ۔"

"پلے ہوئے سانڈ" کی آواز اس کے کانوں میں بھی پڑی تھی، صحن سے گزرتے ہوئے یہ آواز اس کے کانوں میں پگھلا سیسہ ڈال گئی تھی اور وہ دل مسوس کر رہ گیا تھا۔

"سکینہ دھن ہے حوصلہ تمھارا، تم سب جانتی ہو اور منہ سے ایک لفظ بھی نہیں بولتی۔ آخر کب تک ؟"

"میں تو ساری عمر اس طرح کاٹ سکتی ہوں، صرف تم میرے ساتھ رہو ۔"

"میں تمھارا ساتھ کبھی نہ چھوڑوں گا، مطمئن رہو ۔"

"تم میرے ساتھ ہو تو میں سارے گھر کا کام کر کے اور سب باتیں سن کر بھی نہ تھکوں گی، بد دل نہ ہوں گی !"

اور اس نے اپنا سر اس کی گود میں رکھ دیا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگا، وہ اس کی گود ہی میں سر رکھے سو گئی، وہ بڑی دیر یوں ہی بیٹھا رہا۔ کمرے میں بتی جلتی رہی، وہ اسے بجھانے کے لیے بھی نہ اٹھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے ان کے کمرے میں جھانک کر

دیکھا تھا، اس نے اٹھ کر بتی بجھادی۔

"جادوگرنی ہے۔" دوسرے دن اس کے کانوں نے سنا۔" جادو کر رکھا ہے اس پہ، نہ کوئی وسب نہ گن اور یہ نخرہ۔"

ماجھے نے تو اس کے گن ہی دیکھے تھے، کوئی نخرہ نہ دیکھا تھا، بے چاری صبح سے شام تک کام میں لگی رہتی۔ برتن، کپڑے، روٹی، ہانڈی اور اس پہ جو بھینس گھر میں باندھ رکھی تھی۔ اس کا سارا کام، دہی، لسی، مکھن سب اسی کے سپرد تھا۔ سراج کی بیوی اب اکثر دیر ہی سے اٹھتی اور کبھی کبھار ہی گھر کے کام کاج میں نظر آتی۔

"اس بچاری کو اپنے بچوں کا تھوڑا کام ہے۔"

بچوں کا کام بھی سکینہ خوشی سے سنبھالنے کو تیار تھی مگر اسے تو ان کے قریب بھی نہ پھٹکنے دیا جاتا تھا۔

"اسے کیا پتہ بچوں کا، رہنے دے!"

سراج کی بیوی کے نیا بچہ آنے والا تھا، اس لیے اسے اور بھی زیادہ دھتکارا جاتا، اس سے پرہیز کیا جاتا۔

"اس کا سایہ نہ پڑے اس پہ۔"

یہ پرہیز دیکھ کر آخر ماجھے سے نہ رہا گیا۔

"سکینہ ہم علیحدہ گھر لیں گے!"

"نہیں ماجھے۔ ماں باپ کا بڑا حق ہوتا ہے۔"

"ہاں ہوتا ہے مگر برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں بغیر کسی قصور کے تیری بری حالت ہو رہی ہے۔ جب ہم دونوں راضی ہیں تو کسی کو کیا!"

"میں تم سے کب کوئی گلہ کرتی ہوں۔"

"یہی تو بات ہے، میں تو سب جانتا ہوں نا۔ ہم ضرور علیحدہ گھر لیں گے! میں نے پکا فیصلہ کر لیا ہے۔"

اس فیصلے۔ بظاہر سب نے افسوس کیا اسے روکنا بھی چاہا مگر وہ نہ رکا۔

"تم سے وہ منحوس سایہ دور لے جا رہا ہوں جس سے تم ڈرتے ہو!"

"تم تو خواہ ناراض ہو رہے ہو، ہم سب اس کے خلاف کچھ کہتے ہیں؟"

"پرہیز تو اس طرح کرتے ہو جیسے خدا جانے کیا۔ اب وہ بھابھی کے کمرے میں نہیں جا سکتی اس کا کھانا نہیں بنا سکتی، اس کے ساتھ دو باتیں نہیں کر سکتی۔"

"یہ تم نہیں سمجھ سکتے، ان دنوں میں ایسی باتوں کا پرہیز ہوتا ہے!"

"تم تو شرک کرتے ہو!"

"بڑا آیا شرک کا" اس کا بھائی بھی غصے میں بول پڑا "اب ہمیں مسئلے سمجھانے چلا ہے بڑا عالم کہیں کا!"

"اتنا کیوں ڈرتے ہو بھا جی — پہلا بچہ ہے کیا؟"

"تو کیوں جلتا ہے، اپنی اس پہلوان کو بھی پوچھ، کھاتی پیتی سب کچھ ہے پھر بھی بنجر کی بنجر۔"

"آپ کا تو نہیں کھاتی، میں کماتا ہوں اور کس کے لیے کماتا ہوں۔"

اور سراج کے نئے بچے کے آنے سے پہلے اس نے گھر تبدیل کر لیا۔

اس گھر میں جا کر سکینہ کے فکر تو کافی حد تک دور ہو گئے، اب اس پہ آوازے کسنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ اپنے گھر میں آزاد تھی۔ گھر کی مالکن، کام کاج بھی کم ہو گیا تھا۔ دو بندوں کا کام ہی کیا، وہ جلد جلد کام نمٹا لیتی اور پھر سارا دن اداس اور ویران لیٹی رہتی۔

لیٹے لیٹے اس کا دل کسی نہ کسی بہانے اپنے بچوں کے متعلق سوچنے لگتا۔ کاش اس کے گھر بھی کوئی بچہ ہوتا جو تنہائی کے اس وقت میں اس کا ساتھ دیتا۔ اس کی گود میں سوار ہوتا۔ اس کے پیٹ پہ بیٹھتا، اس کے ساتھ شرارتیں کرتا، ہنستا دوڑتا، روتا اور پھر اس کے سینے سے لگ کر سکون حاصل کرتا۔

بڑا ہوتا، اس کے ساتھ ننھی ننھی باتیں کرتا، کھیلتا، اچھلتا کودتا۔ وہ اس کا کام کاج کرتی، اسے نہلاتی دھلاتی، صاف ستھرے کپڑے پہناتی، ماں باپ کے گھر لے جاتی، اپنے رشتہ داروں

ملنے والوں کے گھر جاتی، ماجھے کے رشتہ داروں کے ہاں۔

شادی کے بعد اپنے ماں باپ کے گھر بھی وہ کم ہی گئی تھی، وہ جب بھی گئی اس کی ماں نے اس سے پہلا سوال ہی یہ کیا۔

"سکینہ تم خوش تو ہو، تمھارا آدمی تو اچھا ہے؟"

"میں تو بہت خوش ہوں اپنے گھر اور وہ، وہ تو بہت ہی اچھے ہیں ماں"

"پھر تمھاری صحت پہلے کی سی کیوں نہیں، تم اداس اداس کیوں نظر آتی ہو؟"

"نہیں ماں ایسی تو کچھ بات نہیں، میں اداس کہاں ہوں، اچھی بھلی تو ہوں، ذرا گھر کی ذمہ داری ہوتی ہے"

"ارے ابھی ایسی ذمہ داری کہاں، نہ کوئی بال نہ بچہ، پھر بھی تم گھر سے نہیں نکلتیں"

"ارے بیٹا ابھی تک بچے کی امیدداری کیوں نہیں!"

"اللہ کی مرضی"

اور اس کی ماں ہاتھ پھیلا پھیلا کر اس کے لیے دعائیں کرتی۔

ماجھا علیحدہ گھر لے کر جب بھی ماں کے گھر گیا۔ انھوں نے اس سے یہی کہا "ماجھے، اب تو بہت دیر ہو گئی شادی کو، کوئی بچہ ہونا ہوتا تو ہو جاتا، تیری اور شادی کر دیتے ہیں"

"نہیں میں اور شادی نہیں کروں گا"

"نہیں کیوں بیٹے؟ اس بنجر زمین سے تجھے کیا سکھ؟ بال بچے ہوں گے تو گھر بھرا نظر آئے گا۔ اس بات کی اجازت تو شرع نے بھی دے رکھی ہے!"

"میں نہیں سمجھتا ماں مسئلوں کو —— مگر ایک بات ہے ماں، اگر تمھاری اپنی لڑکی ہوتی اور اس کا خاوند دوسری شادی کرنے جاتا تو تم کو کیسا لگتا؟"

اور ماں بظاہر ناراض ہو کر چپ ہو جاتی "اب تم سے بحث کون کرے تم اب بڑے پڑھ لکھ گئے ہو"

اور اس کے جانے کے بعد اس کی ماں مصلّے پر بیٹھ کر دعائیں مانگتی۔ مولویوں کے پاس

تعویذ پینے جاتی "میرے بیٹے پر جادو کر دیا ہے اس ناشدنی نے۔"

اور پھر مولویوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تعویذ بہانے بہانے سے اسے کھلائے جاتے مگر وہاں تو جادو اس قدر زبردست تھا گویا یہ تعویذ اس کے سامنے کوئی چیز ہی نہ تھے، ان کا کچھ بھی تو اثر نہ ہوتا۔

مگر سکینہ کی صحت اب پہلے کی سی نہ تھی، وہ اندر ہی اندر گھلتی جا رہی تھی۔ ماجھا اس کا بڑا خیال رکھتا تھا، اس کو بہت حوصلہ دیتا مگر اسے تو جیسے گھن لگ رہا تھا، وہ روز بروز آہستہ آہستہ تحلیل ہوتی جا رہی تھی، اس کے سارے کپڑے اسے ڈھیلے ہونے جا رہے تھے، اس کا جسم زرد ہو رہا تھا اور اس کی طاقت جواب دے رہی تھی۔ آہستہ آہستہ سانس پھولنے لگی اور بخار رہنے لگا۔

اور یہ سب برداشت کرتی ہوئی وہ ایک دن اللہ کو پیاری ہو گئی۔ ماجھا رو رو کر اپنا برا حال کر رہا تھا، بظاہر باقی گھر والے بھی اس کے لیے بہت افسوس کر رہے تھے اور اس کی اچھی باتیں دہرا رہے تھے۔ ماجھے کی ماں، سراج کی بیوی بین کرتے ہوئے اس کی خوبیاں گنوا رہی تھیں۔ مگر ماجھے کو تو جیسے سی بات کا ہوش ہی نہ تھا، وہ لاش سے لپٹ لپٹ کر رو دیا۔ ہفتوں بعد تک اس کی آنکھیں خشک نہ ہوئیں۔

اب اس کا گھر کا قیام پھر مختصر ہو گیا تھا، سارا سارا دن وہ گھر سے باہر رہتا، یا دکان یا پھر بیوی کی قبر پر۔

"جادو ابھی اترا نہیں اس پر سے۔ اب تو اس کی شادی ہی اسے راہ راست پر لا سکتی ہے۔" اور شادی کی بات بار بار اسے سمجھائی جاتی، جان بوجھ کر یہ ذکر شروع کر دیا جاتا اور بہانے بہانے اسے جتایا جاتا کہ اس کا علاج شادی ہے۔

"وہ تو میں ایک بار کر چکا ہوں!"

"اس کا کیا فائدہ"، ماں کہتی "اب کے میں تیرے لیے ایسی بھاگ بھری ڈھونڈھ کر لاؤں گی جو گھر کو سجا دے۔ جس آنگن میں بیٹھے وہاں چاند کی سی روشنی پھیل جائے۔ تو سب کچھ بھول جائے گا، سکینہ کیا چیز تھی؟"

"مری ہوئی کو برا نہ کہو ماں!"

"اس نے مجھے کون سا سکھ دیا، اس نے تجھے کون سا سکھ دیا، کوکھ جلی، بنجر زمین، میں تو زبردستی تیری دوسری شادی کرکے رہوں گی۔"

"ایسا ظلم نہ کرنا ماں، یہ سکینہ ہی تھی جو میرے ساتھ گزارا کر گئی۔ تجھے کیا پتہ ماں زمین ہی بنجر تھی یا — ؟"

نسیم خانم

گھسیا بیگم

آج برسوں کے بعد پھر جلال میاں کہیں سے آدھمکے تھے۔

دس برس کی مدت ——!! یوں لگتا تھا جیسے دس صدیاں گزر گئی ہوں —— ان صدیوں میں میں نے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ مگر جلال میاں میرے ذہن سے کسی بھوت بلا کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ اب بھی کبھی بیٹھے بٹھائے جلال میاں کا خیال آجاتا تو گالوں پر سوزش سی ہو جاتی۔ لگتا جیسے زخموں میں چیونٹیاں سی رینگ گئی ہوں۔!!

آج جب دروازہ کھول کر اماں نے شور مچایا کہ ——

"اے ہے جلال میاں تم کہاں تھے۔ راہ تکتے تکتے آنکھیں پتھرا گئیں۔ موقعے پہ آئے بس آنکھوں کی سوئیاں نکلنا باقی رہ گئی تھیں۔"

اماں کی آواز کان میں آئی تو بیچ صحن میں کوڑے کا ڈھیر چھوڑ کر اپنی کوٹھری میں آگھسی۔

آج برسوں بعد اماں کی آواز میں جوش تھا، طنطنہ تھا۔ دس سال کی ساری داستانیں ایک ہی زبان میں پوچھے چلی جا رہی تھیں۔

میں پھولی پھولی سانس لئے دھم سے جھلنگا سے پلنگ پر گر پڑی۔

"تمھاری صورت پہ پھٹکار جلال میاں!! آج برسوں بعد پھر میری پرسکون دنیا میں طوفان اٹھانے کو تم کہاں سے آن مرے۔ میں تو کبھی کا تم پہ فاتحہ پڑھ بیٹھی تھی۔!!"

جلال میاں اگر نام کے ہی جلال میاں ہوتے تو صبر تھا۔ وہ تو کمبخت نرے جلالی تھے۔ جب میری گدّی پہ چار انگل اونچی کسی جکڑی چٹیا کو پکڑ کر میرے سوکھے گالوں پہ بھرپور چانٹا رسید

کرتے تو چار موٹی موٹی انگلیاں یوں ابھر آتیں جیسے کسی مشاق ماہر مصور نے بڑی چابکدستی سے نقش و نگار بنا دیئے ہوں۔

میں سسکی سی بھر کر ہونٹ کاٹ کر رہ جاتی ـــ تب ہی دل سے بد دعا نکلتی "اللہ کرے جلال میاں کو ڈھائی گھڑی کا ہیضہ ہو!!"

آج سے دس برس پہلے جلال میاں ہمارے گھر کسی آفت کی طرح نازل ہوئے تھے۔ اماں کی اکلوتی بہن کے اکلوتے بیٹے تھے۔ انھیں آسمان نہ چڑھا سکیں تو سر چڑھا لیا اور میں اماں کی اکلوتی بیٹی ان کے آنے سے یتیم و لیسیر سی بن کر رہ گئی۔

پہلے جو چیزیں اماں مجھے پیار بھری زبردستیوں سے کھلاتیں وہ سب ان کے پیٹ میں جاتا۔ میں دور دور سے ان کو کھاتے دیکھ کر دل ہی دل میں کوستی ـــ "تمھیں ڈھائی گھڑی کا ہیضہ ہو جلال میاں۔!!"

مگر ساری بد دعائیں جانے کہاں چلی جاتیں۔ جلال میاں سارے گھر میں یوں دندناتے پھرتے جیسے سامنے آنے والوں کو قدموں تلے روند ڈالیں گے۔

ابا بچارے دفتر میں چپراسی تھے۔ جب پہلی تاریخ کو وہ پینسٹھ روپے لاکر اماں کے ہاتھ پہ رکھتے تو آنکھوں کے کونوں کو دوپٹے کے پلو سے رگڑ کر کہتیں۔

"اے رضیہ کے ابا ـــ میں ان روپوں کو اوڑھوں بچھاؤں یا کھلاؤں پہناؤں۔؟" ابا بگڑ کر چیختے ـــ "مجھے بیچ آؤ۔ میں چوری کرنے سے تو رہا!"

اور پھر سارا دن اماں منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی پھرا کرتیں۔

پھر اچانک ہی کہیں سے جلال میاں آدھمکے۔

دس کلاسیں کیا پڑھے تھے یوں لگتا جیسے دنیا کے سارے قاعدے قانون ان کے سامنے کھلی کتاب کی طرح پڑے ہوں۔ اماں پہ تو یوں رعب گانٹھا کہ اپنی دس سال کی محبت اماں کے دل سے کچے رنگوں کی طرح کٹ گئی۔

شاید اماں مجھے ان کے برابر پیار کرتیں۔ مگر میرے ستارے تو جلال میاں کی صورت

دیکھتے ہی گردش میں آگئے تھے۔ وہ آتے ہی کسی دفتر میں بابو لگ گئے۔ جب پہلی مرتبہ انھوں نے اماں کے ہاتھ پر ایک سو اکیس روپے ساڑھے تین آنے رکھے تو اسی شام اماں نے مجھے پھکنی سے خوب لال کیا۔ صرف اتنی سی بات پر کہ جس گلاس میں جلال میاں کو پانی دیا تھا اس کے پیندے میں راکھ لگی رہ گئی تھی اور جلال میاں بجائے اس کے کہ بڑھ کر اماں کا ہاتھ روک لیتے ـــــ بیٹھے ہی بیٹھے بولے کہ ـــــ لاؤ خالہ اماں ادھر لاؤ میں اس سے پوچھوں، اور اماں نے دوہتڑ کمر پر جما کر کہا تھا۔

"حرامزادی دس سال کی ہوگئی ـــــ ابھی اسے گلاس پکڑنے کی تمیز نہیں آئی"، تب ہی جلال میاں کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ گیا تھا۔

"خالہ اماں یہ دس برس کی ہے؟"

"ہاں میاں ـــــ اماں نے مزید گھونسہ مار کر کہا۔

نصیبوں جلی کمبخت گھسی گھسائی میرے لئے رہ گئی تھی۔"

اور اسی دن سے جلال میاں نے مجھے رضیہ بیگم سے گھسیا بیگم کہنا شروع کر دیا تھا۔ اماں جب مجھے رضیہ بیگم کہہ کر پکارتیں تو لگتا جیسے منہ میں شکر سی گھل گئی ہو۔

پر اماں اب تو جلال میاں کے کانوں سے سنتیں، ان کی آنکھوں سے دیکھتیں اور ان کی ہی زبان سے بولتی تھیں۔

وہ بھول گئیں کہ مجھے دس سال سے اب تک رضیہ بیگم کہہ کر پکارتی چلی آرہی تھیں ـــــ جلال میاں کے منہ میں دوزخ کے انگارے۔

میں جل کر دل کے پھپولے پھوڑتی۔

وہ جب میرے متعلق کچھ بات کرتے گھسیا بیگم ہی کہہ کر بات کرتے۔

جب آواز دیتے گھسیا بیگم کہہ کر پکارتے۔

رفتہ رفتہ مجھے یوں لگنے لگا کہ اگر جلال میاں زندگی بھر کو آپڑے تو میں سچ مچ اپنا اصلی نام بھول کر گھسیا بیگم ہی رہ جاؤں گی۔

میں نے اور تیزی سے جلال میاں کو کوسنا شروع کر دیا۔

جب اماں نماز پڑھ کر دعا منگواتیں کہ کہو

"اللہ میاں ابا کی کمائی میں برکت دے!!"

تو میں بڑے خشوع و خضوع سے دل ہی دل میں کہتی۔

"اللہ میاں جلال میاں قیامت کے دن شیطان کی صورت میں پیدا ہوں"

اماں کہتیں ——"اللہ میاں ابا کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھ!!"

"ان کے ہاتھ پیر نیلے اور منھ کالا ہو۔ ان کے گلے میں جوتیوں کا ہار ہو اور اللہ میاں وہ گدھے پر سوار ہوں"

میں آنکھیں بند کر کے جلدی جلدی دعا کرتی۔

"یہ کیا کوڑے کے ڈھیر لگے ہیں خالہ اماں —— آپ کے گھر کے انداز نہیں بدلے" جلال میاں کی آواز تیر کی طرح کانوں کو لگی ——"گھسیٹا بیگم تو کہیں پائینچے چڑھائے گلی میں دوڑتی پھر رہی ہو گی!!"

"اری گھسیا —— کہاں جا ری —— !!" آج برسوں بعد پھر اماں تھالی کا بینگن بن گئی تھیں۔

میں نے دھک دھک کرتے دل کو ہاتھوں سے سنبھالا۔

"اللہ تم سے سمجھے جلال میاں آتے ہی زہر اگلنے لگے"

ان دس برسوں میں جب سے جلال میاں کی پوسٹنگ اچانک ہی کسی دوسرے شہر میں ہو گئی تھی۔ میں پھر سے اماں کی آنکھ کا تارا بن گئی تھی۔

جلال میاں کے جانے کے بعد پھر گھر میں وہی غریبی نیستی آ گئی تھی جو کبھی ان کے آنے سے پہلے ہوا کرتی تھی۔ ابا کی پینسٹھ روپے تنخواہ نے پہلے سے زیادہ جو تم پیزار مچائی تھی اور اسی دکھ میں ابا چل بسے تھے۔ پینسٹھ روپوں کا رہا سہا سہارا بھی ختم ہوا تو اماں کو ان کی قدر آئی۔

گھٹی گھٹی سی سانسیں بند کوٹھری میں کراہیں بن بن کر ابھرنے لگیں تو میں بوکھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

دروازے کی جھری سے آنکھ لگا کر صحن میں جھانکا تو جلال میاں کا پچھایا نظر آیا۔ وہی پرانے

اندازمیں گردن تک بڑھے بال اور چوڑے چوڑے شانے دیکھ کر جھرجھری سی آگئی۔ اب تو وہ پہلے سے کہیں زیادہ لحیم شحیم ہو گئے تھے۔

اماں نے شاید ابھی ابا کے مرنے کی تفصیل سنائی تھی، میلے کچیلے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں رگڑتے ہوئے اماں چھکوں پھکوں رو رہی تھیں۔

جلال میاں سن سے بیٹھے تھے جیسے سانپ سونگھ لیا ہو۔

سوکھے سوکھے حلق کو تر کرنے کے لئے تھوک نگلتے ہوئے اماں نے بھرائی آواز میں کہا۔

"بس یوں سمجھو جلال میاں گویا قیامت ہی ٹوٹ پڑی تھی ——— میرا نصیبوں جلی کا کسی نے پلو بھی نہ دیکھا تھا۔ در در سلائی مانگنے کو پھری۔ لوگ یوں دھتکارتے جیسے میں خارش زدہ کتیا ہوں۔!!"

"رضیہ اس وقت نویں میں پڑھتی تھی۔ گھر میں بھلا کیا دھرا تھا جس کے بل پر میں اسے پڑھاتی۔ یوں دیکھنے میں تو وہ ہڑدنگی گھوڑی سی پھرے تھی۔ مگر نگوڑ ماری کے حلق میں نوالہ کانٹا بن گیا۔ لاکھ لاکھ میں نے سمجھایا وہ بھلا کب ماننے والی تھی۔ مجھے زبردستی گھر میں بٹھا کر خود نوکری کرنے کو نکل کھڑی ہوئی۔!!"

اماں سانس لینے کو رکیں تو جلال میاں چونک کر بولے۔

"تو خالہ اماں کیا وہ نوکری کرتی ہے ——— ؟ کسی اسکول میں پڑھاتی ہوگی؟"

"کہاں میاں ——— نصیبوں میں جو لکھا ہے وہ تو دیکھنا ہی پڑے گا کسی کمپنی میں پیکنگ کرنے پر ملازم ہے۔ نوے روپے مہینہ ملتا ہے ——— مجھے کیا اچھا لگے ہے۔ جلال میاں۔!!" اماں دوپٹے میں منہ چھپا کر آج مہینوں بعد بلک کر رو دیں۔

"مجھے تو وہ سارا روپیہ جو وہ میرے ہاتھ پر دھرے ہے۔ سانپ بچھو معلوم ہووے۔"

"ہے کہاں وہ ——— ؟" جلال میاں میری کوٹھری کی طرف لپکے تو میں سہم کر دیوار سے لگ کھڑی ہوئی۔

"گھسیا بیگم ——— !" انھوں نے ملگجی سی روشنی میں آنکھیں پھاڑ کر مجھے نیچے سے اوپر تک دیکھا۔

"رضیہ ـــــ" ان کے لہجے میں دھیما پن آگیا۔

"مجھے پہچانتی ہو ـــــ؟"

پہلی مرتبہ ان کی زبان سے اپنا نام سنا تو بے اختیار آنکھیں اٹھا کر ان کو اتنے قریب سے دیکھ لیا ـــــ چہرے کی چٹانوں والی سختی مسکراتی نگاہوں سے جھاگ بن کر اڑ گئی تھی۔

دوسرے دن سویرے ہی کمپنی جانے کو برقع اوڑھ کر میں دروازے سے نکلی تو جلال میاں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

"اتنی صبح کہاں چلیں ـــــ؟" انھوں نے حیرت سے پوچھا۔

"جہاں جاتی ہوں ـــــ"

"کمپنی ـــــ؟"

"ہاں ـــــ" میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"اندر آؤ ـــــ" وہ اشارہ کرتے ہوئے گھر میں گھس گئے۔

"خالہ اماں ـــــ اب رضیہ کمپنی نہیں جائے گی ـــــ وہ میری طرف دیکھے بغیر اماں سے مخاطب تھے۔ شریف عورتیں بھلا کہیں ایسی نوکریاں کرتی ہوں گی؟"

"تم جانو جلال میاں ـــــ" اماں نے گویا فوراً ہی میرے سارے اختیارات چھین کر ان کو سونپ دیئے۔

میں نے جھلا کر اماں کو دیکھا۔ میرے جذبات سے بے نیاز وہ جلدی جلدی جلال میاں کے لئے سینی میں ناشتہ لگانے میں مصروف تھیں۔

میں پیر پٹختی ہوئی اپنی کوٹھری میں آئی۔ برقعہ اتار کر کھونٹی میں ٹانگنے کی بجائے کونے میں کھینچ مارا۔

"اللہ تم سے سمجھے جلال میاں ـــــ!!" میں اوندھے منہ پلنگ پر گر کر پھوٹ پڑی برسوں بعد تم میری دنیا میں حشر برپا کرنے کو کہاں سے آن مرے ہو"

زندگی جیسے تیسے گذر رہی تھی بھلی تھی ـــــ کوئی انگلی اٹھانے والا تو نہ تھا۔ اماں پر

بے تحاشہ ہی غصہ آنے لگا۔ وہ کیوں کسی پر اعتبار کرتی ہیں۔

"جلال میاں کیا ہماری زندگی کے ٹھیکیدار ہیں ــــــ کل کلاں کو پھر کہیں چل پڑیں گے اور ہم نئے سرے سے جوتیاں چٹخاتے در در کی خاک چھانتے پھریں گے۔

ایسے میں بے اختیار ابا کی یاد آئی تو دنوں بعد سسکیاں بھر بھر کر رونا آیا۔ جانے کب تک بے دم سی پلنگ پر پڑی رہتی کہ نامعلوم بھاری بھاری بوجھ شانے پر محسوس ہو ــــــ گھبرا کر آنکھیں کھولیں تو جلال میاں کا چہرہ اتنے نزدیک نظر آیا کہ دل کی دھڑکن آپ ہی آپ ڈوبتی محسوس ہوئی ــــــ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

"آپ ــــــ!! جلال میاں ــــــ!!

"تم رو رہی تھیں ــــــ" انھوں نے میری آنکھوں میں گھورا۔

"نہیں ــــــ نہیں تو ــــــ" میں نے بھیگی ہوئی آنکھوں کو ہتھیلیوں سے صاف کرتے ہوئے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔

"میں یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ رضیہ میرے ہوتے ہوئے تم نوکری کے لئے کمپنیوں کی خاک چھانتی پھرو ــــــ یوں سڑکیں ناپتی پھرو۔"

"جب تک میں زندہ ہوں تم کیوں روزگار کی فکر کرتی ہو ــــــ؟"

میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے ان کو دیکھ رہی تھی۔ جلال میاں کا پرانا وجود آہستہ آہستہ دھندلکوں میں تحلیل ہو رہا تھا۔ نئے جلال میاں کا ٹھنڈا ٹھنڈا احساس دھیرے دھیرے رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا۔

انھوں نے میرے نرم ملائم ہاتھ کو اپنے کھردرے ہاتھوں میں دبا لیا۔

"اب میں ساڑھے چار سو روپے پاتا ہوں رضیہ ــــــ!! پھر کیوں تمھیں غم امروز و فردا ہو؟ یہ سب کچھ تمھارے ہی لئے ہے ــــــ!"

ہمارا کیا ہے جلال میاں ــــــ میں طنز سے ہنس پڑی۔ آپ نے کیا ہماری زندگیوں کا ٹھیکہ لیا ہے۔ پہلے کی طرح پھر کبھی آپ غائب ہو جائیں گے اور ہم نئے سرے سے جوتیاں

چٹخاتے پھریں گے۔"

"نہیں نہیں ——— یوں مت کہو۔" انھوں نے میرے ہاتھ کو اور مضبوطی سے دبا لیا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں ——— اب کبھی تمھیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا ——— اب کبھی نہیں جاؤں گا۔"

"جلال میاں ———" میں نے بے یقینی سے ان کی طرف دیکھا۔

"کہو تو خط غلامی لکھ دوں گھسیا بیگم ———!" انھوں نے جھکتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانکا۔"آپ جائیں جلال میاں۔"

میں نے جھینپ کر دوپٹے میں منہ چھپا لیا۔!!

مخدوم محی الدین

بلّور

منوّر خموشی کے بلّور چھنکے
کرن مرمریں فرش پر چھن سے ٹوٹی

کلی چٹکی، آواز کے پھول مہکے

رنگوں کی سروں کی کوئی کہکشاں
کھلکھلاتی ہوئی گود میں آپڑی ہے
خموشی کے گہرے سمندر کی تہہ سے
کسی جل پری نے مجھے جیسے آواز دی ہو
اندھیرے کے پردے ہلے، ساز چونکے
کئی نور کی انگلیاں جگمگائیں
شفق در شفق، رنگ در رنگ
عارض کا حیرت کدہ سامنے ہے
وہ ہنستا ہوا میکدہ سامنے ہے
دھنک سامنے ہے

کسی کو یہ قصہ سناؤں تو کیسے؟
قدم اور آگے بڑھاؤں تو کیسے؟

سردار جعفری

رات

انجم و ماہتاب کے سائے میں پھر آئیگی رات
نیلگوں زلفوں کے پیچ و خم میں بل کھائے گی رات
مسکرائے گی گریبانوں میں پھولوں کی طرح
آنچلوں کی ریشمی شکنوں میں لہرائے گی رات
مطربِ رنگیں نوا کے ساتھ ہو گی نغمہ سنج
ساقئ کافر ادا کے ساتھ اٹھلائے گی رات
شعلہ پیکر قامتوں کے حلقۂ آغوش میں
کہکشاں کے پیرہن میں رقص فرمائے گی رات
عشق کے لب سے پئے گی جرعۂ آبِ حیات
حسن کے پیمانۂ سیمیں کو چھلکائے گی رات
چشمِ ساقی ہی میں ٹھہرے گی نہ زلفِ بادہ میں
ساغر و مینا کے پینے سے ابل جائے گی رات
جرعہ جرعہ کرکے ذوقِ تشنگی پی جائے گا
قطرہ قطرہ کرکے پیمانوں میں ڈھل جائیگی رات
رنگِ خونِ آرزو بن کر سحر ہوگی طلوع
دردِ دل بن کر مگر سینے میں رہ جائیگی رات
رنگ و بو کا کارواں غنچوں کی آوازِ جرس
دور بادِ صبح کی صورت نکل جائے گی رات

احمد ندیم قاسمی

التجا

حکم موت لائے ہو
لیکن التجا یہ ہے
زور سے نہ چلاّؤ
کچھ قریب آجاؤ
تم کو جو بھی کہنا ہے
تیوروں کو کہنے دو
دبدبے کو رہنے دو
میں کہ ایک شاعر ہوں
کھیتوں کا رکھوالا
نرمیوں کا متوالا
میری یہ تمنا ہے
میری موت یوں آئے
پچھلی رات کو جیسے
ایک تارہ ٹوٹا ہو
ایک تیر چھوٹا ہو

مصطفیٰ زیدی

لاینحل

زباں پہ مہرِ گدائی ہے کس سے بات کروں
حروف کاسہ بے مایہ ہیں، قلم کشکول
ضمیر بے حس و حرکت ہے، زیست بے پہلو
شکن ہے سینۂ بے تہہ میں، آستین پہ جھول
میں خود طلسم کی پریوں سے بے کنار ہوا
کسے کہوں کہ مری روح کے دریچے کھول

میں اک سراب کی خواہش پہ بیچ آیا ہوں
تمام بادہ و ساغر تمام تشنہ لبی
حریمِ عقل میں جس کا کوئی جواز نہ تھا
نشاطِ دل تھی وہی زندگی کی بے سببی
اُجڑ گئے مرے گلگشت، میرے رکنا باد
مری دعائے سحر، مری آہ نیم شبی

کہاں وہ دن تھے کہ پروائے ننگ و نام نہ تھی
کہاں یہ وقت کہ سایہ سنبھل کے چلتا ہے
مجھے کسی بھی تعین پہ اختیار نہیں
یہ کوئی اور مرے راستے بدلتا ہے
جنوں سے رسم نہ رکھوں تو جاں سلگتی ہے
طلب کا قرض اتاروں تو جسم جلتا ہے

روشؔ صدیقی

رباعیات

سب نقشِ قدم، چھپا دیئے ہیں میں نے
سجدوں کے نشاں مٹا دیئے ہیں میں نے
جب سے دیکھا ہے خلوتِ دل میں تجھے
لاکھوں پردے گرا دیئے ہیں میں نے

خوابِ شبِ ہجر بھول جانے دے مجھے
اب حسرتِ دید کو جگانے دے مجھے
فردا نے پہن لیا، لباسِ امروز
اے حسنِ ازل نقاب اٹھانے دے مجھے

کونین سے دُور جا کے دیکھا ہے تجھے
شمعِ مکاں بجھا کے دیکھا ہے تجھے
کیا ذکر یہاں نگاہِ دل کا اے دوست
میں نے سب سے چھپا کے دیکھا ہے تجھے

کیا مرگ ہے کیا حیات، میں کیا جانوں
کیا ہے لبِ کائنات، میں کیا جانوں
اے حلقۂ زلفِ دوست عمر تو دراز
کہتے ہیں کسے نجات، میں کیا جانوں

شاذؔ تمکنت

ایک نظم

سنا ہے زیست سے تم نے نباہ کر لی ہے
مفاہمت کا یہ سودا کہیں گراں تو نہ تھا!
سُبک سری تو نہ ٹھہری بلاکشی کے عوض
کوئی فریفتہ، کوئی کشاں کشاں تو نہ تھا!

بتا سکو تو بتا دو ہمیں بھی راز کی بات
یہ بات کیسے بنی، کیسے کار و بار ہُوا
یہ لین دین کا جھگڑا چکا تو کیسے چکا
پتہ چلے تو سہی کون کس پہ بار ہُوا
اُدھر سے کون سی شرطیں تھیں، کیا تقاضے تھے
اِدھر سے کون سا پیمان استوار ہُوا

چھڑے تو ہوں گے پرانے، نئے گلے شکوے
نگاہ کس کی جھکی، کون شرمسار ہُوا
شمارِ حسرتِ ناکام بھی ہُو ہو گا
اگر ہُوا تو ہمارا ابھی کچھ شمار ہُوا

وزیر آغا

درماندہ

رس بھرا لمحہ
بجانے کن کٹھن راہوں سے ہو کر
آج میرے تن کے اس اندھے نگر میں
ایک پل مہماں ہوا

رس بھرا لمحہ
سمے کی شاخ سے ٹوٹا
میری پھیلی ہوئی جھولی میں گر کر
آج میرا ہو گیا

یک بیک
قرنوں کے ٹھہرے کارواں نے جھرجھری لی۔ چل پڑا
رس بھرے لمحے کا محمل
اونٹنی کی پشت پر مچلا
سنہری گھنٹیوں نے چیخ کر مجھ سے کہا:
تو رہ گیا!

رضی اختر شوق

قبر

"ہو" کا عالم ہے نہ اپنا نہ پرایا کوئی
نہ کوئی شاخ جو تعظیم سے سایہ کو جھکے
نہ کوئی دوست کہ جو اشک بہانے کو رکے
نہ کوئی ہاتھ جو رکھ دے مرے سینے پہ گلاب
سب ستم خوردہ و مجبور سب ہی پا بہ رکاب
سب کے سینوں پہ ہے خود اپنی ہی قبروں کا عذاب

خیریت پوچھنے والے یہ بھلا کیا جانیں
اپنی ہی مرگ جواں سال کا نوحہ ہوں میں
اپنی ہی قبر کا ٹوٹا ہوا کتبہ ہوں میں
یہ بھی اک رسم ہے کہتے ہیں کہ زندہ ہوں میں

مظفر علی سید

شہادت کی شکلیں

شہادت کی شکلیں بہت ہیں
نظر کی شہادت،
کہ ہم نے جو دیکھا ہے آنکھوں سے اپنی
کیسے سمجھ لیں، نہیں ہے؟

زباں کی شہادت
کہ منہ سے جو نکلے گا، اس کا نتیجہ
ہمیں ہی بھگتنا پڑے گا

قلم کی شہادت،
کہ تحریر کی روشنائی
ہزاروں برس تک چمکتی رہے گی

مگر
ساری شکلوں سے افضل
لہو کی شہادت
کہ مضمر ہے جس میں
نظر کی صداقت
زباں کی گواہی
قلم کی سیاہی

عادل منصوری

دودھ کی بُوند اگر صبح کی چھاتی پہ گرے

شام ٹوٹے تو ستاروں کی نقابیں الٹیں
کانچ کے خواب اُتر جائیں زمیں کے دل میں
وقت کے جسم سے لمحات کا آنچل سرکے
میری ویران ہتھیلی میں نئی گھاس اُگے
گرم ہونٹوں سے ملیں نرم ہوا کی آنکھیں
اور ملبوس مرے جسم سے باغی ہو جائے
خون کی قوسِ قزح اس کے بدن میں کھنچ جائے
دودھ کی بوند اگر صبح کی چھاتی سے گرے
دودھ کی بوند اگر صبح کی چھاتی سے گرے

ندا فاضلی

چاند

نیل گگن میں تیر رہا ہے اُجلا اُجلا پُورا چاند

کن آنکھوں سے دیکھا جائے سندر چہرے جیسا چاند

مُنّی کی بھولی باتوں سی چھٹکیں تاروں کی کلیاں

پپّو کی خاموش شرارت سا چُھپ چُھپ کر ابھرا چاند

مجھ سے پوچھو کیسے کاٹی میں نے پربت جیسی رات

تم نے تو گودی میں لیکر گھنٹوں چوما ہوگا چاند

پردیسی سونی آنکھوں میں شعلے سے لہرائے ہیں

بھابی کی چھیڑوں سے بادل، آپا کی چٹکی سا چاند

تم بھی لکھنا تم نے اس شب کتنی بار پیا پانی

تم نے بھی تو چھجے۔ اُوپر دیکھا ہوگا پُورا چاند

راج نرائن رازؔ

کھاری جھیلیں

ساگر کا یہ کھاری پانی

کرلیتا ہے اپنے جیسا

جھرنوں کے میٹھے پانی کو

موہ پریم کی ڈور میں بندھ کر

آملتا ہے جو ساگر میں

میری آنکھیں، آنکھیں کیا ہیں

جھیلیں ہیں کھاری پانی کی

جھانکو گے تو پچھتاؤ گے

ناچ رہی ہیں جو آنکھوں میں

ساری خوشیاں کھو جائیں گی

وقار عظیم

خطوں کی روشنی میں

اُردو ادب میں خطوط کا ذخیرہ دنیا کی دوسری زبانوں کے مقابلہ میں کم ہے لیکن دلچسپی، ادبیت اور تنوع میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ ہماری مشرقی احتیاط پسندی مصلحت اندیشی اور اخلاق پرستی نے بہت سے اچھے خطوط مٹی میں ملا دیئے لیکن جو ہیں ان کی دلکشی کم نہیں ہے۔ پروفیسر وقار عظیم نے چند اہم اردو ادیبوں کی خطوط نویسی کا جائزہ لیا ہے اور بعض کام کی باتوں کی طرف اشارے کئے ہیں ــــ ادارہ

(۱) غالب

مغرب میں مکتوب نگاری کی صنف جن مرحلوں اور منزلوں سے گزری ان میں سے ہر ایک میں کچھ خط لکھنے والے ایسے ہیں جو اپنے اپنے انفرادی انداز نگارش کی بدولت سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اور ایسے ناموں کی فہرست خاصی طویل ہے لیکن اُردو میں مکتوب نگاری یا خطوط نویسی کا ذکر چھیڑئے تو ایکا ایکی غالب کا نام ذہن کے افق پر ابھرتا اور اس صنف کے ان سب تقاضوں کا احاطہ کر لیتا ہے جو اس صنف کے ساتھ مخصوص ہو گئے ہیں۔

غالب شاعر بھی ہیں اور نثّار بھی۔ انھوں نے اُردو اور فارسی دونوں میں شعر بھی کہے اور نثر بھی لکھی لیکن خود ان کی نظر میں ان کی فارسی شاعری اور فارسی نثر اُردو شاعری اور اردو نثر کے مقابلے میں زیادہ معزز اور زیادہ معتبر ہے۔ یہ بات اور ہے کہ خود غالب دنیا کی نظر میں معزز اور معتبر ہوئے تو اپنی اُردو شاعری کی بدولت کہ وہ غزلوں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ ہے اور اپنی اُردو نثر کے طفیل کہ جو ان خطوں پر مشتمل ہے جو انھوں نے اکثر و بیشتر اپنے دوستوں اور شاگردوں کو لکھے۔ یہی خط ہیں کہ اس سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی ماحول اور فضا کا آئینہ ہے جس میں غالب

نے جنم لیا اور جس میں ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل ہوئی۔ یہی خط ہیں کہ انھوں نے غالب کے دل آویز شعر کو دل نشینی کی دولتِ جاوداں عطا کی۔ یہی خط ہیں کہ روشِ خاص نے نثر کے بھولے بھٹکے مسافر کو سیدھا اور ہموار راستہ دکھایا لیکن ان سب باتوں سے بڑھ کر یہ کہ ان خطوں نے ہمیں غالب سے روشناس ہونے اسے جاننے پہچاننے اور اس سے قریب ہونے میں مدد دی، یہاں تک کہ ہم میں اور اس میں ذرا بھی فاصلہ نہ رہا۔ ہم اپنے آپ کو اُردو کے کسی شاعر سے اتنا قریب محسوس نہیں کرتے، جتنا غالب سے۔ غالب کے کلام کا یہ وصف اسے اُردو شاعری میں منفرد بناتا ہے کہ اس کے اکثر شعری تجربے ہیں اس کے نہیں اپنے تجربے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی انسان دوستی اور اس کی عالی ہمتی اس کے قلب کی گہرائی اور اس کی نظر کی گہرائی، اس کے احساس اور ادراک کی تیزی اور توانائی، اس کی خود بینی و خود پسندی، اس کی آزادی و بے باکی، غمِ عشق اور غمِ روزگار سے نبرد آزما ہونے اور انھیں زیر کرنے کا حوصلہ اور سب سے بڑھ کر زندگی کو زندگی سمجھ کر اسے برتنے کا سلیقہ اس کی شخصیت کے اجزا ہیں۔ اور یہ سب اجزا غالب کے شعروں سے نکل اور اُبھر کر ہمارے اندر سما جاتے ہیں اور یوں ہم صرف نظر ہی سے نہیں دل سے بھی اس لافانی شخصیت کے نقوش کا مشاہدہ کرتے اور اس کی عظمت کے آگے سر جھکا دیتے ہیں لیکن اس کی شخصیت کی محبوبی صرف اس کے خطوں کے آئینہ میں نظر آتی ہے۔ غالب کی شخصیت کا رکھ رکھاؤ، اس کا سلیقہ، اس کی نفاست اس کا تہذیبی اور اشرافی رچاؤ صرف خطوں کی روشنی میں دکھائی دیتا ہے۔ اپنے بے تکلفی سے لکھے ہوئے خطوں میں غالب نے اپنے دُکھ کو جس لطافت سے بیان کیا۔ اور اپنی کمزوریوں کو جس بے تکلفی سے بے نقاب کیا ہے۔ اُس نے عظمت کے اس تصور کو زیادہ رنگین اور زیادہ با معنی بنا دیا ہے جو اس کی شاعری نے ہمیں دیا ہے۔ غالب کا تخیل شعری شخصیت کے جس داخلی عالم کو آشکارا نہیں کر سکا تھا۔ اسے خط کی بے لوث حقیقت نگاری نے اجاگر کیا۔ ان کی شاعری کا ہجر صرف ہجر ہے اس سے زیادہ کچھ اور نہیں لیکن ان کی نثر کا ہجر، ان کے خطوں کا ہجر ایک مستقل وصال ہے۔

غالب کے خط پڑھ کر ہمیں بہت سے انکشاف ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر ان کی ذات

کے متعلق ہیں۔ جہاں غالب نے اپنے دل کی حکایتیں یوں کھول کر دنیا کے سامنے رکھ دی ہیں کہ ان کا کوئی راز راز نہیں رہا لیکن لطف یہ ہے کہ اپنے باطن کو اسی طرح بے محابا دوسروں کے سامنے کھول کر رکھ دینے والا منفرد انسان کسی ایک جگہ بھی اپنے گرد و پیش کی زندگی سے الگ ہو کر یا اس کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اپنے دوستوں سے باتیں نہیں کرتا۔ اس نے اپنے جذبے اور احساس کو ہمیشہ اپنے دور کے جذبے اور احساس کا ایک الگ نہ ہونے والا حصّہ سمجھا ہے، اس لئے غالب کے خطوں کی روشنی میں ہمیں غالب محض اپنا ترجمان نہیں بلکہ اپنے عہد کے پورے سیاسی اور تہذیبی انقلاب کا ترجمان دکھائی دیتا ہے۔

غالب کے خطوں نے اردو والوں کو پہلی مرتبہ یہ بات سکھائی کہ خط، خط لکھنے والے کی خارجی اور داخلی دونوں طرح کی زندگیوں کا آئینہ ہیں۔ خط محض نجی حالات کے اظہار کا وسیلہ نہیں بلکہ خط لکھنے والا اسے پورے دور کے حالات کا عکس بنا سکتا ہے۔ خط لکھنا باتیں کرنے کا دوسرا نام ہے۔ لیکن یہی باتیں علمی طور اور ادبی نکات کے حل اور ان تک رسائی کا سب سے مؤثر وسیلہ بھی ہیں۔ خط لکھنا بجائے خود کوئی مہم نہیں لیکن ان کے ذریعے بڑی سے بڑی مہم طے ہو سکتی ہے اور یہ مہم غالب نے اس طرح طے کی کہ مراسلہ نگاری میں وہ جس طرز کے موجد ہیں اس کے خاتم بھی ہیں۔ انھوں نے مراسلہ نگاری کی جس روش کو بُرا کہا ہے اس کی سب سے بڑی خرابی رسم و قیود کی پابندی ہے۔ غالب فرہاد پر اس لئے طعنہ زن ہیں کہ وہ سرگشتۂ خمارِ رسم و قیود ہے۔ پھر خط لکھنے میں ان کی شخصیت کی انفرادیت اس اسلوب کو کس طرح اختیار کرتی جو کام چلانے کے لئے تیشے کا پابند اور محتاج ہے۔

(۲) سر سید

غالب بلاشبہ مکتوب نگاری کے ایک خاص طرز کے موجد ہیں۔ لیکن یہ ایجاد ایک شاعر کی ایجاد ہے۔ ایک ایسے شاعر کی ایجاد ہے جسے اپنی ذات عزیز ہے اور اس لئے عزیز ہے کہ اس نے اپنی اندرونی عظمت کو پہچانا ہے، اسی لئے جب یہ خود بین و خود شناس شاعر خطوں کو خیال کے اظہار کا ذریعہ بناتا ہے تو ایک لمحے کے لئے بھی ان کا دامن اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا اور غالب کے خطوں کی روشنی میں جس تہذیبی انقلاب کا عکس نظر آتا ہے۔ اس میں غالب کی ذات

ہر بڑی سے بڑی اور نازک سے نازک حقیقت پر چھائی ہوئی ہے۔ سیاسی انقلاب سے پیدا ہونے والا ایک زبردست تہذیبی انقلاب سمٹ کر خطوں کی روشنی کے اس مینار کے گرد آگیا ہے۔ یہاں تنہا غالب کا پیکر اس انقلاب کی واضح اور جیتی جاگتی علامت ہے۔

غالب کے خطوط کے فوراً بعد نظر اس صنف کے جس دوسرے روشن مینار پر پڑتی ہے۔ وہ سرسید کے خطوط ہیں۔ یہ خطوط شاعر کے نہیں بلکہ مصلح (یا سرسید اور ان کے عہد کی مروجہ اصطلاح استعمال کی جائے تو ایک رفارمر) کے لکھے ہوئے ہیں: ایک ایسے مصلح یا رفارمر کے جس نے اپنی ذات کو سب کچھ سمجھنے کے بجائے قوم کو سب کچھ سمجھا ہے۔ اس کی ذات اپنے گوناگوں اوصاف کی بنا پر منفرد بھی ہے اور عظیم بھی لیکن قوم کے اس فرزند کی عظمت اس میں ہے کہ اس نے اپنے آپ کو اس کُل کا ایک جُز سمجھ کر سوچا اور محسوس کیا ہے جس کا نام قوم ہے اور جسے اس نے خواب غفلت سے بیدار کرنے اور جس کی شخصیت کے تعمیر کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے اس نے قوم کی بھلائی کو اپنی بھلائی اور قوم کی بڑائی کو اپنی بڑائی سمجھا ہے۔ اس کے نزدیک فرد کا معزز اور محترم ہونا منحصر ہے قوم کے معزز اور محترم ہونے پر اور آدمی کی بڑائی اسی میں ہے کہ قوم کی بڑائی کے حصول کے لئے اپنا سب کچھ قربان و نثار کردے۔

شخصیتوں اور مزاجوں کے فرق اور سوچنے اور محسوس کرنے کے فرق نے غالب اور سرسید کے خطوں کے موضوع میں بھی فرق پیدا کیا ہے اور بیان میں بھی۔ اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے مماثل اور مشابہ ہونے کے باوجود دونوں کے خطوط ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں۔ سب سے بڑا فرق تو یہ ہے کہ غالب کے خطوط کی مشعل ہمیں اس انقلاب کی تصویر دکھاتی ہے جو ابھی ابھی ختم ہوا ہے۔ اور بعض حیثیتوں سے اب بھی جاری ہے۔ سرسید کے خطوں کی روشنی میں ہم آنے والے انقلاب کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ غالب کے خطوں کی حیثیت ایک اہم تاریخی دستاویز کی ہے۔ یہی بات سرسید کے خطوط کے متعلق بھی کہی جاتی ہے۔ اس لئے کہ ان میں ہمیں اس ردِ عمل کی تصویریں دکھائی دیتی ہیں جو اس انقلاب کا لازمی نتیجہ ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ غالب کے خطوں میں یہ ردِ عمل سمٹ کر صرف ایک ذات کا ردِ عمل بن گیا ہے اور سرسید کے خطوں میں اس نے

پوری قوم کے ردِّ عمل کی صورت اختیار کی ہے۔

سرسیّد کے خطوں کے موضوعات کا ذکر کرتے ہوئے کسی نے لکھا ہے کہ ان کے موضوع صرف تین ہیں...... مدرستہ العلوم، تہذیب الاخلاق اور سائنٹیفک سوسائٹی۔ بات بظاہر بالکل صحیح ہے۔ لیکن غور کیا جائے تو یہ تین موضوعات غدر کے بعد کے ہندوستان اور خصوصاً مسلمان کی زندگی میں پیدا ہونے والے بے شمار موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں اور ان بے شمار موضوعات کا تعلق مسلمانوں کی تہذیبی، اخلاقی، ادبی، سیاسی، معاشرتی، اور اقتصادی زندگی کے حال اور مستقبل سے ہے۔ مسلمانوں کی زندگی کے ایک بے حد عبوری اور بحرانی دَور میں حالات جس تیزی سے بدل رہے ہیں اور قلب و ذہن کی کیفیتوں میں انتشار، تزلزل اور بیم و رجا کے جو آثار ظاہر ہو رہے ہیں، سرسید کے خط ان کا عکس اور آئینہ ہیں۔ اس اعتبار سے ہم انھیں حال کے تلخ حقائق کی بے باکانہ اور سفاکانہ مصوری بھی کہہ سکتے ہیں اور مستقبل کی آرزوؤں، امنگوں اور حوصلوں کی ترجمانی بھی۔

سرسیّد کے خطوط کی روشنی میں ان کے لکھنے والے کی شخصیت کی جو تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ ایک دانا و بینا و مصلح اور معمارِ قوم کی ہے، جس نے اپنا تن، من، دھن سب کچھ قوم پر نثار کر دیا۔ اس مصلح اور معمار کے مزاج میں ایک طرف تو وہ جرأت اور اولو العزمی ہے کہ وہ اپنی کشتی کو منجدھار کے حوالے کر کے ہی مطمئن ہوتا ہے، لیکن دوسری طرف یہ عجز و انکسار کہ کشتی کو منجدھار میں ڈال کر وہ اللہ کو اس کشتی کا ناخدا جانتا ہے، ان خطوں کی روشنی میں ہمیں مصلح کی عظمت کے ساتھ ساتھ ہر جگہ انسانی عظمت کے جلوے دکھائی دیتے ہیں۔ اور اس انسانی عظمت کے عناصر ہیں حق گوئی و بے باکی، ہمت اور عالی حوصلگی، دردمندی و ایثار، خلوص اور پاسِ وضع جاں سپاری و جاں نثاری۔ خطوں میں اپنے دوست دشمن سے صرف قوم کی فلاح و بہبود کی باتیں کرنے والے سرسید میں نظر کی تیزی ہے، ذہن کی دُور رسی اور قلب کی صفائی اور پاکیزگی، اور ان چیزوں نے اس انسان کو اپنے عہد کا سب سے بڑا مسلمان بنایا ہے اور یہ سب کچھ ہمیں سرسیّد کے خط پڑھ کر معلوم ہوتا ہے۔

خط ہمیشہ زندگی کا آئینہ ہوتے ہیں۔ سرسید کے خط بھی ہیں، اس مفہوم میں بھی کہ ان میں ان کے اپنے شب و روز کے مشاغل بیان ہوئے ہیں لیکن اس معنی میں وہ ہرگز نجی نہیں کہ سرسید کے شب و روز ان کے شب و روز نہیں ان کی قوم کے شب و روز ہیں۔

غالب کے خطوں کو ان کی وہ معجز بیانی زندہ رکھے گی جو مکتوب نگاری کے اسلوب کی معراج ہے۔ سرسید کے خطوط بیان کے اس خلوص، بے باکی اور صداقت کی وجہ سے زندہ رہیں گے، جس نے حقیقت پر کسی طرح کے تکلف و تصنع کا رنگ نہیں چڑھنے دیا!

(۳) شبلی

شبلی کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے جو بے شمار باتیں کہی گئی ہیں، ان میں سے جو بات سیدھی تیر کی طرح دل میں اُترتی اور بیٹھ جاتی ہے۔ یہ ہے کہ وہ پہلے یونانی ہیں جو مسلمانوں میں پیدا ہوئے لیکن بات سننے والا جب اس شاعرانہ بات کے اچانک ردعمل سے اپنے ذہن کو آزاد کرتا ہے تو شبلی کی شخصیت کے اور بہت سے پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ رومانیت ان کے مزاج کی سب سے ابھری ہوئی خصوصیت ہے اور اس خصوصیت نے انھیں ماضی اور اس کی ہر اس چیز کا شیدائی بنایا ہے جس میں جلال ہے اور جس میں جمال ہے۔ شبلی کی رومانیت نے انھیں جلال پسند اور جمال پرست بنایا ہے۔ اور وہ ماضی کے جلال و جمال پر جان فدا کرتے ہیں۔ حال میں اس کے سرچشمے تلاش کرتے ہیں اور مستقبل میں ان کا پرتو اور عکس دیکھنے کے آرزومند ہیں۔

شبلی کے مکاتیب ان کی شخصیت کے انہی جلالی اور جمالی اوصاف کا پرتو ہیں۔ ان کے دل میں قوم کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ یہ درد قوم کو ایک خاص طرح کی زندگی کے سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھنے کا آرزومند ہے لیکن حالات ایسے ہیں کہ شبلی کی یہ آرزو پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ شبلی کے مکاتیب کی تڑپ اس خونِ تمنا کی کہانی ہے ——— یہ کہانی زیادہ جاں گداز اس لیے بن جاتی ہے کہ شبلی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ خون تمنا کا قصاص کس سے طلب کریں۔

شبلی کے معاصرین میں سے کسی میں اتنے اوصاف اور کمالات یکجا نظر نہیں آتے ہیں جتنے شبلی میں ہیں۔ وہ عالمِ دین ہیں، وہ مورخ اور محقق ہیں، وہ سوانح نگار ہیں، وہ شعر کے مزاج

شناس اور مبصر ہیں۔ وہ ماہر تعلیم ہیں۔ اور بعض حیثیتوں سے اپنے عہد کے سب سے پہلے سیاسی شاعر ہیں۔ ان کی شخصیت ان کے کمالات کا اظہار ان کی معرکتہ الآراء تصانیف میں تو خیر ہوا ہے۔ ان کے مکاتیب بھی شخصیت کے ان گوناگوں پہلوؤں کے آئینے ہیں اور اس کا نتیجہ ہے کہ یہ خطوط حالی، شبلی، سرسید احمد، نذیر احمد کے عہد کے ملکی قومی مذہبی علمی تعلیمی اور اصلاحی رجحانات کا آئینہ بھی بن گئے ہیں۔ —— ایسا آئینہ جو سرسید کے خطوط اس لئے نہ بن سکے کہ ان میں شبلی کی طبیعت کا رومانس جوش و خروش اور اس سے پیدا ہونے والا اضطراب نہیں۔ سرسید کے خط قومی مذہبی، سیاسی، علمی، تعلیمی اور اصلاحی تصورات کی گہری تفسیر اور تعبیر ہو کر بھی شبلی کے خطوط کی اس صفت سے خالی ہیں جسے ہم صرف تڑپ کے لفظ سے ظاہر کر سکتے ہیں۔

شبلی کے مکاتیب کی یہ تڑپ اس "انا" اور اپنی عظمت کے اس شعور کا عکس ہے جو غالب کے خطوط میں تو جا بجا نظر آتی ہے لیکن سرسید اور نذیر احمد کے خطوط میں نہیں۔ شبلی کے خطوط ایک اور لحاظ سے بھی سرسید اور نذیر احمد کے خطوط کے مقابلے میں ہمیں اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ شبلی نے زندگی کے ہر گوشے کے ساتھ اپنا گہرا جذباتی رابطہ قائم کیا ہے۔ وہ ملکی، قومی، تعلیمی، مذہبی، علمی اور ادبی زندگی میں ہر جگہ حسن دیکھتے ہیں اور اس بات کے آرزومند ہیں کہ یہ حسن اس طرح پھیلے کہ ہر دوسری چیز پر چھا جائے، اس لئے وہ قومی زندگی کا بڑے سے بڑا منصب ادا کرتے ہوئے بھی نو زندگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے ہیں۔ مکتوب نگاری کی تاریخ میں شبلی سے پہلے یہ بات ہمیں صرف غالب کے یہاں نظر آتی ہے۔

سرسید اور نذیر احمد کے خطوں کی طرح شبلی کے خطوں میں بھی حد درجہ کا خلوص ہے۔ تصنع اور ریاکاری کا شائبہ تک نہیں لیکن جو جرأت اور بے باکی سرسید کے خطوں کا بہت بڑا امتیاز ہے اور جس صاف گوئی نے نذیر احمد کی نصیحتوں میں کہانی کی لذت پیدا کی ہے اس کی صورت شبلی کے یہاں حسین تر ہے۔ ان خطوں کی جرأت جرأت رندانہ ہے۔ یہاں عالمانہ لہجے کی متانت اور ثقاہت کے ساتھ ساتھ دوستانہ چھیڑ چھاڑ کی بے تکلفی بھی ہے اور عاشقانہ احساس کی رنگینی بھی اور اس چیز نے شبلی جیسے فاضل اجل کے خطوط کو خیال اور بیان دونوں کی رعنائی کا ایک ایسا مرقع

بنایا ہے کہ اس آئینے میں ہمیں وہ رنگین مزاج شاعر بھی نظر آتے ہیں اور جمال آفریں مصور بھی۔

(۴) اکبر

غالب سے اقبال تک جتنے ادیبوں اور شاعروں نے اپنی مکتوب نگاری کی بدولت دلوں میں جگہ بنائی، ان میں اکبر کی حیثیت اس لحاظ سے منفرد ہے کہ خطوں کا جتنا بڑا ذخیرہ انھوں نے چھوڑا کسی اور شاعر اور ادیب کے خطوں کا سرمایہ اس سے آدھا بھی نہیں۔ اکبر کے خطوں کے جتنے مجموعے مرتب ہوئے ہیں اور افسوس ہے کہ ان کے کلامِ نظم کی طرح ان میں سے کوئی سلیقے سے مرتب نہیں ہوا، ان میں کئی سو خط ہیں اور خط مرتب کرنے والوں نے برابر یہ اعتراف کیا ہے کہ یہ خط ان خطوں کے مقابلے میں جو اکبر نے اپنے احباب اور معاصرین کو لکھے تعداد میں بہت کم ہیں۔ جو خط دستبردِ زمانہ کے ہاتھوں تلف و ضائع ہوئے ان کی تعداد بھی سینکڑوں سے کم نہیں ——— لیکن خطوط کے جو چھ سات مجموعے اس وقت مہیا ہیں انھیں دیکھکر اندازہ ہوتا ہے کہ اکبر کے جو خط ہم تک نہیں پہنچ سکے، وہ موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے ان خطوں سے زیادہ مختلف نہیں ہوں گے ——— یہ خط جنھیں خطوط بھی کہا گیا ہے اور رقعات، مکتوبات اور مکاتیب بھی، سیاسی، معاشرتی، دینی، اخلاقی، علمی، ادبی اور شاعرانہ مسائل کے علاوہ نجی زندگی کے واقعات اور خط لکھنے والے کی ذہنی اور قلبی کیفیات کا آئینہ ہیں۔ اور ان خطوں کی سب سے بڑی خصوصیت جو انھیں غالب کے خطوں سے بھی زیادہ ایک امتیازی حیثیت دیتی ہے، یہ ہے کہ ان میں ہمیں وہی اکبر سوچتا، محسوس کرتا، دردِ دل کی داستان سناتا، تڑپتا، تلملاتا اور اپنے کرب کو ہنس کر رنگ دیتا ہوا ملتا ہے۔ جس سے ہم اس کی ہمیشہ زندہ رہنے والی شاعری میں واقف اور آشنا ہوتے ہیں۔ اکبر کے دل کی بے لوث سچائی نے ان کی شاعری کی طرح ان کے خطوں کو بھی ان کے ظاہر و باطن کا آئینہ بنایا ہے۔ اکبر کی شاعری ایک ایسے عہد کی شاعری ہے جسے اکبر نے انتشارِ قومی اور بدگمانی کی فضا کا عہد کہا ہے، ایک ایسا عہد ہے جس میں "باخبر" اور "صاحبِ دل"، "مسلمان بڑی مصیبت میں" اور عظیم خطرات سے دوچار ہے۔ ایک ایسا عہد جس میں بقول ان کے پولٹیکل پہلو پر تو بہت شور و شغب ہے لیکن

اخلاقی اور روحانی پہلوؤں کی طرف کسی کا دھیان نہیں اور یہی اکبر کا غم، یہی ان کا درد اور یہی ان کا کرب ہے، اور اس غم، درد اور کرب کی تصویر جس طرح ان کی شاعری ہے اسی طرح ان کے خطوط، اس اعتبار سے کہ دونوں کا موضوع بھی ایک ہے اور فن بھی۔ دونوں اکبر کی شخصیت کے آئینے ہیں، لیکن خطوں میں بعض اوقات اثر اس لئے بڑھ جاتا ہے کہ یہاں بات کہنے والا بات شاید اس لئے کہہ رہا ہے کہ اس کے دل کا غم ہلکا ہو۔ غم کی بات سنا کر اپنے عزیزوں کو اپنے غم میں شریک کر لینے میں جو انسانی پہلو ہے وہی ان خطوں کی نفسیاتی تاویل ہے۔

یہ خط اکبر کی شخصیت کی عظمت کے آئینے ہیں۔ اس طرح کہ اکبر نے اپنے خطوں میں (صدہا خطوں میں جو ہزار کے قریب پہنچتے ہیں) اپنے غم میں کہ جسے وہ "پرائیویٹ غم" کہتے ہیں اور قوم کے غم میں کہ وہ ان کے لفظوں میں "پبلک غم" ہے فرق نہیں کیا —— اور جب کبھی یہ کہا کہ میری عمر ترددات میں گزری تو ساتھ ہی یہ بات بھی کہہ دی کہ مسلمانوں کی عام قسمت یہی ہے۔ اکبر کے خطوں کو میں نے ان کے غموں کی داستان کہا ہے۔ ایسی داستان جس کا ہیرو خود داستان گو ہے اور اس کے گرد و پیش کی ابتر زندگی اس داستان کا پس منظر اور اسٹیج، خطوں کی داستان کا یہ ہیرو زندگی کے اس انقلاب کو دیکھ رہا ہے جو مسلمانوں کو تباہی اور بربادی کی طرف لے جا رہا ہے لیکن اس کی شاعری کی طرح اس کے خط بھی ہمیں بتاتے ہیں کہ اس نے جو کچھ کہا ہے وہ اس لئے کہ اس طرح انقلاب رک جائے گا۔ اس کی کوشش تو صرف یہ ہے کہ اس کا کلام یادگار انقلاب بن کر زندہ رہے اور یہ منصب اکبر کے خطوں نے بھی ادا کیا جو ہمیں بتاتے ہیں کہ اکبر زندگانی کو بے حلاوت اور خودکشی کو ناجائز سمجھ کر اپنی دیوانگی کا علاج مذہب اور فلسفۂ تصوف میں تلاش کرتے ہیں اور اپنے آپ کو اس خیال سے تسکین دیتے ہیں کہ موحد کا دل ہمیشہ ٹھکانے رہتا ہے۔ یوں اکبر اپنے خطوں کے آئینے میں ایک صاحبِ نظر سیاست دان ایک ژرف بین فلسفی اور دردمند مصلح کے علاوہ اپنے عہد کے ادیبوں، اور شاعروں میں دین اور اس کی سچائی کے سب سے بڑے مبلغ نظر آتے ہیں۔ اسی لئے کسی نے کہا ہے کہ اکبر شاعر اور ظریف شاعر سے پہلے مومن اور مومن گر تھے اور ایسے مومن جو نثر میں بھی اپنی

بات لطیف رمزی اور دل نشین پیرائے میں ادا کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ ان کے خطوں میں نثر کا ایک واضح اسلوب ہے۔ شگفتہ، رواں اور سلیس سجیدگی، اخلاق اور ثقالت سے مبرا بلکہ اور مطالب کی ندرت اور خیالات کی گہرائی سے مملو۔ اکبر نے اسی لطیف اور دل نشین انداز میں اپنے صدہا خطوں میں اپنے اور اپنی قوم کے بے شمار امراض کا ذکر کیا ہے لیکن اللہ پر نظر رکھنے کے سوا انھوں نے ان امراض کا کوئی مداوا نہ تلاش کیا اور نہ تجویز۔

(۵) اقبال

غالب سے اقبال تک ہمارے شاعروں اور ادیبوں کی کاوش نے علم و فضل اور ہنر و فن کی جو دنیا آباد کی ہے اس کی رونق، آب و تاب اور جلوہ گری میں خطوں کو بھی ایک اہم مقام حاصل ہے کہ اس کے آئینے میں ہمیں صاحب فن کی خارجی اور داخلی شخصیت کی، اس کے جسم و جان کے، اس کے ذہن و قلب کی اور اکثر اوقات اس کی مضطرب رُوح کی ایسی زندہ اور جیتی جاگتی تصویر نظر آتی ہے کہ اس تصویر کے سہارے سے ہمیں بات کہنے والے کی بات تک پہنچنے میں بھی مدد ملتی ہے اور اس کے گرد و پیش کی زندگی کا مفہوم سمجھنے میں بھی، اب تک ہم غالب، سر سیدؔ، شبلی اور اکبر کے خطوں کی روشنی میں ان کے کاتب کی شخصیت کو سمجھنے کی کوشش میں مصروف رہے ہیں اور اس کوشش میں جہاں ایک طرف یہ نتیجہ نکالنے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ علمی، ادبی اور قومی و تہذیبی زندگی کے ان اکابر نے ہمیں اپنے مکاتب کے ذریعے اپنے متعلق اور اپنے عہد کے متعلق جو کچھ بتایا ہے اس سے ہم پر زندگی کے بہت سے بھید کھلے اور بہت سے اسرار و رموز منکشف ہوئے ہیں لیکن دوسری طرف ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ ان خطوں میں سے ہر ایک کے خط میں ایک نمایاں انفرادیت بھی ہے اور وہی انفرادیت غالب، سر سیدؔ، شبلی اور اکبر کا امتیاز ہے۔ غالب کے خطوں کا گہرا شخصی اور تہذیبی رنگ، سر سید کا بے مثال قومی احساس، —— شبلی کی دل نشین رومانی شیفتگی اور اکبر کی افسردہ دلی، بے چینی و اضطراب یہ ان شاعروں، ادیبوں، مؤرخوں اور مصلحوں کی منفرد اور ممتاز شخصیتوں کا عکس ہے۔ یہی صورت اقبال کے خطوں کی بھی ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ ان کے مکاتیب میں معانی کی بے شمار سطحیں ہیں۔

ان خطوں کے مطالب کا مدّ و جزر ایک بحرِ بے پایاں کا مدّ و جزر ہے۔

اقبال کی شخصیت تہہ دار اور پہلودار ہے اور زندگی کے اتنے گوشوں کا احاطہ کرتی ہے اور اس کے اتنے رستوں پہ حاوی ہے کہ ہمارے ادب کی کوئی شخصیت ان کی نظیر اور ان کی ثانی نہیں۔

اقبال فلسفی ہیں اور ایسے فلسفی جنھیں مشرق اور مغرب کے فلسفوں پر یکساں عبور ہے، وہ عالم دین ہیں اور ایسے عالم جنھوں نے دین کی صحیح روح کو اپنے اندر جذب کیا ہے۔ وہ سیاست داں ہیں اور دنیا کی سیاست کے پیچ وخم ان کی نظر کے سامنے ہیں، وہ تاریخ داں ہیں اور تاریخ کی روشنی میں حال کا جائزہ لیتے اور مستقبل کی زندگی کا تصور کرتے ہیں۔ وہ شاعر ہیں ان کی حکمت جذبے کے اضطراب کو اپنے اندر سمیٹتی اور سموتی ہے۔ اقبال کی جامع ذات علم کی شیدائی ہے۔ انھیں زندگی کے جس گوشے میں علم کی کوئی کرن دکھائی دیتی ہے بے تابانہ اس کی طرف لپکتے ہیں۔

اقبال کے مزاج میں مشرق و مغرب کی علمی اور اخلاقی قدروں کا ایسا رچاؤ ہے کہ شاذ دیکھنے میں آتا ہے لیکن اس مزاج میں مشرق کی دی ہوئی اور اسلام کی پھیلائی ہوئی قدروں کا غلبہ ہے۔

علم کی کبھی نہ بجھنے والی پیاس، حق کی تلاش، عجز، انکسار، وضع داری، خلوص، حق گوئی، بے باکی، دردمندی، گداز، خود شناسی، فقر اور درویشی اس مزاج کے اہم اجزاء ہیں۔ اور اقبال کے مکاتیب اور ان کی ہمہ گیر شخصیت کا عکس اور یوں گویا ان کی نگاہِ بلند، دلِ غیور اور ذہنِ رسا کا عکس ہیں اور اسی لئے کسی نے اقبال کے خطوں کو اپنے عہد کی علمی اور معنوی یادگار کہا ہے اور کسی نے فلسفے، شعر اور وعظ کا امتزاج۔

ان خطوں کے موضوعات کا دامن بہت وسیع ہے۔ ان میں فلسفہ ہے، سیاست ہے، دین ہے، تاریخ ہے، اخلاق ہے اور ان میں سے ہر ایک میں اقبال کی غیر معمولی بصیرت کی عظمت کے آثار نمودار ہیں لیکن ان خطوں میں اقبال کے کلام کی تشریح اور توضیح کے ایسے نکات ملتے ہیں جن میں بحث، تجزیئے، تاویل اور توجیہہ نے فکر و خیال کی پیچیدگیوں کی عقدہ کشائی کی ہے۔ ان خطوں میں ہمیں اقبال کے علاوہ، جو فلسفیٔ عصر، حکیم امت، مبصر سیاست اور مفسر اخلاق ہے اور اپنی بات حکیمانہ، حقیقت پسندانہ اور متوازن اور دھیمے لہجے میں کہتا ہے۔ وہ اقبال بھی ملتا ہے

جس نے ذہن کی بات کے ساتھ بڑا گہرا جذباتی رشتہ قائم کیا ہے اور جس نے اپنے خطوں کو اپنے نادیدہ اور نامعلوم اضطراب کا آئینہ بنایا ہے۔ ان خطوں میں ہمیں ذہن کی دنیا میں رہنے والے اقبال کے علاوہ اس اقبال سے بھی قریب آنے کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔ جو ہماری طرح گوشت پوست کا ایک معمولی انسان ہے اور اپنے غم میں دوسروں کو شریک کرنے کے علاوہ دوسروں کے غم پر رونے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے۔ وہ بھی دوستوں کے خطوں کو غالب اور شبلی اور اکبر کی طرح زندگی کا سرمایہ جانتا اور اپنی زندگی کے بہترین لمحے ان کے انتظار میں بسر کرتا ہے۔ اس میں سرسید کی عالمانہ شان کی اعلیٰ مقصدیت کے ساتھ ساتھ غالب کی بے چینی، شبلی کی والہانہ شیفتگی اور اکبر کی افسردگی بھی ہے، اس لئے اس کے خط اپنے عہد کی سیاسی، دینی، معاشرتی، فکری اور ذہنی کیفیت کی دستاویز ہونے کے ساتھ ساتھ ایک انسان، زمین پر رہنے والے انسان کے شب و روز کے معمولات کی سرگذشت اور روداد بھی ہیں ——— خواہ ویسی روداد نہ سہی جیسی غالب، شبلی اور اکبر کے خطوں میں یا اس سے کم تر درجے پر سرسید کے خطوں میں ملتی ہے۔

فراق گورکھپوری

وقت آئے گا تو ہوگی بہارِ چمن کی بات
اہلِ وطن ابھی نہ اٹھائیں وطن کی بات

ہر بار اک ادائے تغافل نما کے ساتھ
اس آنکھ نے کہی کسی عہدِ کہن کی بات

راتوں کی خامشی میں، یہ ہر عشوۂ نجوم
سنتا ہوں میں تری نگہِ کم سخن کی بات

افسانہ گو کو یاد نہیں ختم داستاں
چھیڑی ہے اُس نے زلفِ شکن در شکن کی بات

ہے کہ خرامِ ناز کی تصویر کائنات
یاد آگئی ہے ایک غزالِ ختن کی بات

محسوس ہو رہی ہیں دلوں میں گھلاوٹیں
مجنوں کی ہے یہ بات کہ ہے کوہکن کی بات

میری غزل نوائے معانیٔ زندگی
عیش و طرب کی بات نہ رنج و محن کی بات

ہے انکھڑیوں کی شام میں دنیا کی داستاں
ہونٹوں کی صبحِ نو میں ہے باغِ عدن کی بات

آجائے کاش میری نوائے حیات میں
تیرے خرامِ ناز کے آہستہ پن کی بات

اب زندگیٔ عشق میں وہ تازگی کہاں
بوئے بریدہ ہے کسی گل پیرہن کی بات

جاں بازیوں کے اور طریقے ہزار ہیں
کیوں بار بار چھیڑیئے دار و رسن کی بات

ہم تو ہر امتیاز مٹانے کو آئے ہیں
مدت ہوئی کہ بھول چکے ما و من کی بات

دیکھا ہر ایک شاخ پہ غنچوں کو سرنگوں
جب آگئی چمن میں ترے بانکپن کی بات

ہر اک کے پاس حسنِ زبان و بیاں سہی
لیکن کہاں سے لائے کوئی میرے فن کی بات

تارے ہیں آبدیدہ، دلِ آسماں گداز
پہنچی ہے دُور تک مرے شعر و سخن کی بات

ممکن ہے دردِ شامِ غریباں بہل سکے
چھیڑی ہے دل نے دوریٔ اہلِ وطن کی بات

میں نے سنی ہے سیرِ گلستاں کے درمیاں
ہر گل کی خامشی میں ہزاروں چمن کی بات

اے اہلِ ہند تم نے سنی یا نہیں سُنی
ہر مشتِ خاکِ ہند میں دردِ وطن کی بات

وہ دیکھو اس کے پاس کھنچے آ رہے ہیں لوگ
ہر بات ہے فراق کی اک انجمن کی بات

احمد ندیم قاسمی

ہجر کی رات کا انجام تو پیارا نکلا
وہی سورج کہ جو ڈوبا تھا، دوبارہ نکلا

ظلمتِ شب سے ہوا دن کا تصور ممکن
یہ اندھیرا تو اجالے کا سہارا نکلا

تو کہ تھا بزم میں تصویر کم آمیزی کی
میری تنہائی میں کیوں انجمن آرا نکلا

میں ترے قرب سے ڈرتا ہوں کہ تو زندہ ہے
میں سمندر میں جب اترا تو کنارا نکلا

وقت نے جب بھی مرے ہاتھ سے مشعل چھینی
ذہن میں تیرے تصور کا ستارا نکلا

جانے یہ کرب ہے دُوری کا کہ مٹی کا طلسم
سطحِ دریا پہ تو مہتاب دوبارا نکلا

اپنی ہستی کو مٹانے کا نتیجہ یہ ہے
پھول توڑا تو مرے خون کا دھارا نکلا

نفسی نفسی بھی وہی، سحر کی دہائی بھی وہی
تیرا محشر مرا مانوس نظارا نکلا

اب تو پتھر کے زمانے سے نکل آؤ ندیم
اب تو سوچوں کے تصادم سے شرارہ نکلا

ماہر القادری

کچھ دن سے دل میں اب ہوسِ خام بھی نہیں
اس بتکدے کو حاجتِ اصنام بھی نہیں

انسان اور کشمکشِ جبر و اختیار
آزاد بھی نہیں ہے، تہِ دام بھی نہیں

اے دل ادب کہ پرسشِ غم کو وہ آئے ہیں
شکوے شکایتوں کا یہ ہنگام بھی نہیں

اے دوست! احتیاطِ محبت کی داد دے
فریاد کر رہا ہوں، ترا نام بھی نہیں

اے اہلِ تاج و تخت، یہ طغیانِ کبر و ناز
تم کو خیالِ گردشِ ایام بھی نہیں

منزل ہے دُور اور مسافر کا ہے یہ حال
طاقت بقدرِ زحمتِ یک گام بھی نہیں

ماہر میں اپنی ذات سے جو کچھ ہوں ٹھیک ہوں
غالب نہیں ہوں، حافظ و خیام بھی نہیں

پرویز شاہدی

شادابی کے اس بھگدڑ میں روحِ بہاراں بھاگ نہ جائے
دوڑ رہا ہے پتہ پتہ سارا گلستاں بھاگ نہ جائے

بستی بستی ناچ رہی ہے کیسی بھیانک ویرانی
اپنے دیوانوں کو لیکر ساتھ بیاباں بھاگ نہ جائے

اپنی اپنی کالک ملنے عکس ہزاروں لپکے ہیں
آئینہ کی آنکھ بچاکر چہرۂ انساں بھاگ نہ جائے

ڈوبنے والے ڈوب رہے ہیں بیٹھے بیٹھے ساحل پر
چن چن کر دریا کی موجیں شورشِ طوفاں بھاگ نہ جائے

دو ہی ہاتھ ہیں دیوانے کے دونوں گتھ جانے پہ تلے
ڈر ہے کھینچا تانی میں ہر تارِ گریباں بھاگ نہ جائے

ذہن نے اک مدت پر اپنے طوق و سلاسل توڑے تھے
دوڑ رہی ہیں پھر دیواریں پھر درِ زنداں بھاگ نہ جائے

ڈسنے لگی ہے کرنوں کو بھی راتوں کی زہریلی گھٹن
اپنے اجالوں سے گھبرا کر صبحِ درخشاں بھاگ نہ جائے

فارغ بخاری

یادوں کا عجیب سلسلہ ہے
سویا ہوا درد جاگ اٹھا ہے

مٹ بھی چکے نقشِ پا مگر دل
مہکی ہوئی چاپ سن رہا ہے

جلتی ہوئی منزلوں کا راہی
اب اپنا ہی سایا ڈھونڈتا ہے

دیواریں تنی ہوئی ہیں لیکن
اندر سے مکان گر رہا ہے

سوچوں کے اتھاہ پانیوں میں
کھویا ہوا چاند تیرتا ہے

ویرانۂ شب میں جلتے جلتے
دل برف کا پھول بن گیا ہے

پوچھے ہے چٹک کے غنچۂ زخم
اے اجنبی تیرا نام کیا ہے

اظہار کا جس کو حوصلہ ہے
وہ اپنی صدی کا دیوتا ہے

منصور سے کم نہیں ہے وہ بھی
جو اپنی زباں سے بولتا ہے

قاتل کو دعائیں دو کہ فارغ
ہر زخمِ وفا غزل سرا ہے

ادا جعفری

کیا جانئے، کس بات پہ مغرور رہی ہوں
کہنے کو تو جس راہ چلایا ہے چلی ہوں

تم پاس نہیں ہو تو عجب حال ہے دل کا
یوں، جیسے میں کچھ رکھ کے کہیں بھول گئی ہوں

پھولوں کے کٹوروں سے چھلک پڑتی ہے شبنم
ہنسنے کو ترے پیچھے بھی سو بار ہنسی ہوں

تیرے لئے تقدیر مری جنبشِ ابرو
اور میں ترا ایمائے نظر دیکھ رہی ہوں

دل خون ہو لیکن نہیں، توہین گوارا
تم رُک کے بڑھے ہو تو کئی گام ہٹی ہوں

صدیوں سے مرے پاؤں تلے جنتِ انساں
میں جنتِ انساں کا پتہ پوچھ رہی ہوں

جس ہاتھ کی تقدیس نے گلشن کو سنوارا
اس ہاتھ کی تقدیر پہ آزردہ رہی ہوں

قسمت کے کھلونے ہیں، اجالا کہ اندھیرا
میں شعلہ صفت تھی، سو بہر حال جلی ہوں

جاؔوید وششٹ

باعثِ گرمیٔ دل ہے مرے اشعار کا رنگ
تیز ہو جائے نہ کیوں حسن کے رخسار کا رنگ

دیکھکر وقت کی بے کیفیٔ منظر اے دوست
ہم نے شیشے میں بھرا ہے رسن و دار کا رنگ

غم جلاتا ہے دھندلکوں میں تری یاد کی شمع
جگمگا اٹھتا ہے پھر شامِ جنوں یار کا رنگ

کس قدر خونِ جگر صرف کیا ہے ہم نے
دیکھ لے کاش کوئی آپ کے رخسار کا رنگ

شکن آلود جبیں ہے متبسم رخسار
ان کے انکار میں پوشیدہ ہے اقرار کا رنگ

کم نظر اہلِ خرد جس کو جنوں کہتے ہیں
ہم سمجھتے ہیں اسے عشق کے پندار کا رنگ

کیسے ہونٹوں کو میں ساغر سے ہٹاؤں جاؔوید
مجھ کو ساغر میں ملا ہے کسی رخسار کا رنگ

ساقی فاروقی

میں وہ ہوں، جس پہ ابر کا جادو چلا نہیں
بنجر پڑا ہوا ہوں، کوئی دیکھتا نہیں

میں تو خدا کے ساتھ وفادار بھی رہا
یہ ذات کا طلسم مگر ٹوٹتا نہیں

یوں ٹوٹتا ضرور، بکھرتا ضرور ہوں
میں چاک پیرہن نہیں، خونیں قبا نہیں

میں نے اُلجھ کے دیکھ لیا اپنی گونج سے
اب کیا صدا لگاؤں، کوئی جانتا نہیں

حد بندیٔ خزاں سے حصارِ بہار تک
جاں رقص کر سکے تو کوئی فاصلہ نہیں!

مظفر حنفی

دھار پر پاؤں جمانے ہوں گے
دن بہر حال بتانے ہوں گے
آج پھولوں پہ نظر ہے اس کی
کل نشیمن بھی گنانے ہوں گے
غیر کی بات پہ تکیہ نہ کرو
دُور کے ڈھول سہانے ہوں گے
ظلم کرنے کا ارادہ ہوگا
غور کرنے کے بہانے ہوں گے
بات اشکوں کی زبانی ہوگی
جس جگہ تیرے فسانے ہوں گے
چونکہ "نازک ہیں بقول شاعر"
پیار کرنے کے زمانے ہوں گے
خار بن کر جو کھٹکتا ہوں میں
آپ کو پھول چرانے ہوں گے
داستاں موڑ پہ آپہونچی ہے
چار آنسو تو گرانے ہوں گے
جان بخشے گا وہ اس وعدے پر
زخم لوگوں سے چھپانے ہوں گے
طنز کرتے ہیں مظفر صاحب
ان کے دیوان جلانے ہوں گے

محسن احسان

اے جوانی کے سمن زاروں کی تنہا رانی
تیری آنکھوں کے جزیروں میں ہے کیسا پانی

میں بلاتا رہا تجھ کو سرِ صحرائے خیال
تو نے آواز بھی لیکن نہ مری پہچانی

زرد رُو پھول کا چہرے پہ گماں گزرا ہے
آئینہ دیکھ کے کچھ اور بڑھی حیرانی

میں مثالِ شجرِ خشک ہوں محرومِ لباس
تن کے زخموں نے چھپالی ہے مری عریانی

اپنے ہی غم کے اندھیروں میں گرفتار ہیں ہم
اپنے ہی سائے میں ہم لوگ ہوئے زندانی

سرد و بے جان ہوئے دل کے شریانوں میں
ندیوں میں کہاں دریاؤں کی سی طغیانی

گل کی خوشبو نہ مقید کرو زندانوں میں
گلستانوں کا ہے سامان یہ بے سامانی

لُٹ کے بھی کم نہ ہوئی رونقِ میخانۂ دہر
کتنی آباد ہے محسن یہ سرائے فانی

اختر ہوشیارپوری

درد کی دولتِ نایاب کو رسوا نہ کرو!
وہ نظر راز ہے اس راز کا چرچا نہ کرو!

وسعتِ دشت میں دیوانے بھٹک جاتے ہیں
دوستو! آہوئے رم خوردہ کا پیچھا نہ کرو!

تم مقدر کا ستارہ ہو، مرے پاس رہو
تم جبینِ شبِ نمناک پہ اُبھرا نہ کرو!

گھر پلٹ آنے میں عافیتِ جاں ہے یارو
جب ہوا تیز چلے راہ میں ٹھہرا نہ کرو!

یا دلِ دیدہ کو تنویرِ محبت بخشو
یا دمِ صبح زمانے میں اُجالا نہ کرو!

یہ جہانِ گزراں، ہاتھ کسے آیا ہے
پیچھے مُڑ مُڑ کے کسی شخص کو دیکھا نہ کرو!

بھاگتے لمحے کو کب روک سکا ہے کوئی
وہ تو اک سایہ ہے، سائے کی تمنا نہ کرو!

سر سلامت نہیں رہتے ہیں، زباں کٹتی ہے
پتھروں کو کبھی بھولے سے بھی سجدہ نہ کرو!

پیاس بجھتی ہے کہاں تپتے بیابانوں کی
مری آنکھو، مری آنکھو یونہی برسا نہ کرو!

کچھ ادھر سائے ہیں جو بڑھ کے پلٹ جاتے ہیں
اختر اس راہ سے ہو کر کبھی گزرا نہ کرو!

توصیف تبسم

واہمہ ہوگا، یہاں کوئی نہ آیا ہوگا
مرا سایہ ہی مرے جسم سے لپٹا ہوگا

چاند کی طرح نگاہوں میں لئے خوابِ طرب
اور اک عمر ابھی خاک پہ سونا ہوگا

اشک آئے ہیں تو یہ سیرِ چراغاں بھی سہی
اس سے آگے تو وہی خون کا دریا ہوگا

گر کبھی ٹوٹی بدلتی ہوئی رت کی زنجیر
ایک اک پھول یہاں خود کو ترستا ہوگا

ہم تو وابستہ رہے تجھ سے کہ ہے خوئے وفا
تم نے کیا سوچ کے اے غم ہمیں چاہا ہوگا

شوقِ تعمیر بسائے گا خرابے کیا کیا
آدمی ہے تو ہر اک شہر میں صحرا ہوگا

اس کو آنکھوں میں چھپاؤ گے بتاؤ کب تک
کیا کرو گے جو وہی دیکھنے والا ہوگا

ق

سائے بہکے ہوئے گوشوں میں سمٹ جائیں گے
چاند نکلے گا تو یہ شہر اکیلا ہوگا

یاد آئیں گی بہت، نیند سے بوجھل پلکیں
شام کے ساتھ یہ دکھ اور گھنیرا ہوگا

رونا چاہیں گے مگر اشک نہیں ٹپکے گا
گو حباب آسا، ہر اک آنکھ میں دریا ہوگا

ذکاء الرحمن صدیقی

خاموشی خود اپنی صدا ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے
سناٹا ہی گونج رہا ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے

میرا ماضی مجھ سے بچھڑ کر کیا جانے کس حال میں ہو
میری طرح وہ بھی تنہا ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے

صحرا صحرا کب تک میں ڈھونڈوں الفت کا اک عالم
عالم عالم اک صحرا ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے

اہلِ طوفاں سوچ رہے ہیں ساحل ڈوبا جاتا ہے
خود ان کا دل ڈوب رہا ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے

ان مدھ ماتی آنکھوں پر یہ جھوم کے آنا زلفوں کا
بادہ کشوں کا عام صلا ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے

یارو! میرا کیا ہے، کفِ قاتل کی رعنائی دیکھو
خون ہی کیوں ہو، رنگِ حنا ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے

ساری محفل میں اک تم سے اسکو تغافل کیوں ہے ذکا
کوئی خاص اندازِ وفا ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے

جاوید شاہین

جو برف زار چیر دے ایسی کرن بھی لا
پتھر دلوں میں آج کوئی کوہکن بھی لا

اس طرح سرسری مرا بابِ وفا نہ لکھ
وقتِ شمار زخم مرا خستہ تن بھی لا

جلنے لگے ہیں پیاس سے پھولوں کے خشک ہونٹ
ابرِ بہار کو ذرا سوئے چمن بھی لا

منصف اگر بنا ہے تو سب کو گواہ رکھ
انصاف ہے تو میرا پھٹا پیرہن بھی لا

چپ چاپ خلوتوں میں پگھلنے سے فائدہ
کوئی چراغ ہے تو سرِ انجمن بھی لا

اتنا وہ شادماں مجھے اچھا نہیں لگا
اس گُل کے دل میں داغ کی تھوڑی جلن بھی لا

زخمِ سفر کے دردِ مسلسل کا سحر توڑ
بکلا ہوا وطن سے غریب الوطن بھی لا

یہ چشمِ التفات بھی کافی نہیں مجھے
میرے لئے تو نرمئ کام و دہن بھی لا

شاہیں اسے عزیز ہے اپنا لہو تو کیا
نعشِ شہید کے لئے خونیں کفن بھی لا

ناصر زیدی

دل محوِ غم و یاس ہے آنکھوں میں نمی ہے
اک حسرتِ ناشاد کہ پلکوں پہ تھمی ہے

کل رات بھی وعدے کا ترے دل کو یقیں تھا
کل رات بھی لیکن مری رو رو کے کٹی ہے

منسوب ہوئی ہے مری وحشت کے چلن سے
جب بھی ترے آنگن سے کوئی بات چلی ہے

پھر مجھ کو اسی شوخ سے اُمیدِ وفا ہے
دل جس کا محبت کے تقاضوں سے تہی ہے

لے آئی ہے ساتھ اپنے ترے جسم کی خوشبو
شاید یہ صبا بھی ترے کوچے سے چلی ہے

اے گردشِ حالات کا رخ پھیرنے والے
انساں سے کبھی وقت کی رفتار تھمی ہے

غنچہ کوئی چٹکا جو گلستاں کی فضا میں
ناصر مرے احساس کو اک ٹھیس لگی ہے

اقبالؔ متھاس

چھا گئی ہے عرصۂ ہستی پہ گہری تیرگی
ڈھونڈ کر لاؤ کہیں سے دوستو اب روشنی

شام ہوتے ہی یہ کس منزل کی جانب چل پڑے
کاش خاکِ راہ مجھ کو روک کر یہ پوچھتی

اسطرح دھڑکا ہے دل اک اجنبی کے سامنے
جس طرح وہ شکل تھی میری کہیں دیکھی ہوئی

تیرے آنے سے ہوا ہے لالہ و گل کا ہجوم
رہگذارِ زیست پہلے کس قدر ویران تھی

کل جہاں ہر موڑ پہ تھے قہقہوں کے جلترنگ
آج اس بستی میں آہیں بھر رہی تھی خامشی

راستے میں بیٹھ جانے کا صلہ اقبالؔ کیا
پاؤں اٹھے ہیں تو منزل بھی نظر آنے لگی

حبابؔ ہاشمی فتحپوری

وہ ہم پر ملتفت ہیں آج ان کو ہے ہمارا غم
ہمارے واسطے ان کی بھی آنکھیں ہو گئیں پرنم

نہ منزل کا پتہ ہے کچھ نہ مقصد کی خبر لیکن
کچھ ایسا شوق ہے دل میں چلا جاتا ہوں میں پیہم

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے
تبسم گُل کا بھی ہوتا نہیں بارِ گراں سے کم

ہمارا کارواں اب تک سرِ منزل نہیں پہونچا
لے گی کیسے منزل جب ہے میرِ کارواں برہم

ترے احباب کیوں طوفان سے تجھکو ڈراتے ہیں
حبابؔ خستہ تیری زندگی طوفاں میں ہے پیہم

تبصرہ

ترا شیدہ
از شاذ تمکنت - نیشنل بکڈپو - مچھلی کمان - حیدرآباد

:- قیمت پانچ روپے :-

گذشتہ ڈیڑھ دو سال کے اندر اردو کے نئے شعراء کے جتنے مجموعے شایع ہوئے ہیں، اتنی مختصر مدت میں شاید ہی کبھی اور اتنے دلچسپ، اہم، خیال انگیز اور دیدہ زیب مجموعے نکلے ہوں گے۔ پھر بھی شاذ تمکنت کا مجموعہ ان میں گم نہیں ہوتا، متوجہ کرتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ اُس میں خردلی آزادی کا نام لے کر عجیب و غریب فلسفہ پیش کیا گیا ہے یا ذاتی تجربہ کے پردہ میں وہ باتیں کہی گئی ہیں جو کسی کا تجربہ نہیں ہیں، نہ ہیئت، علامت سازی، انتخابِ الفاظ کے ایسے تجربے کیے گئے ہیں جن سے لطف اندوز ہونے کے لیے پڑھنے والے کو اپنے احساسِ جمال سے ہاتھ دھونا ضروری ہو۔ اس کے برعکس اس مجموعہ میں انسانی تجربے، انفرادی جذبات اور تصوّرات کی مدد سے فنکارانہ رنگ میں پیش کیے گئے ہیں۔ شاذ کو اپنے عہد کے انتشار اور وقت کی سرگرانی کا شدید احساس ہے لیکن اس نے نہ تو انھیں قنوطی بنایا ہے اور نہ زندگی سے بیزار، ماحول کی المناکی کا احساس آج کس حساس انسان کو نہیں لیکن مایوسی کا شکار ہو جانا نہ اس کا مداوا ہے اور نہ مکمل اظہارِ حقیقت۔ شاذ تمکنت نے اپنی شاعری میں اِن حقائق کو موضوع بنایا ہے اور اپنے انداز میں۔

ترا شیدہ میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی اور ان کی تعداد قریب قریب برابر ہے۔ طرز اظہار کے لحاظ سے یہ دونوں صنفیں مختلف ہیں اور شاذ نے اس امتیاز کو برقرار رکھا ہے تاہم مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ان کی نظمیں غزلوں سے زیادہ جاندار اور بھرپور ہیں اگرچہ غزلوں میں بھی ایسے اشعار مل جاتے ہیں جو چونکانے والے ہیں۔

سید احتشام حسین

اخبار و آثار

تلوک چند محروم کے خطوط اور تصاویر کی تلاش

عیسیٰ خیل (میانوالی) کے مشہور ادیب جناب ندیم نیازی تلوک چند محروم کی شخصیت اور ان کے فن پر ایک کتاب ترتیب دے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں انھیں مکاتیب اور تصاویر کی ضرورت ہے جن حضرات کے پاس ان کے خطوط یا تصاویر ہوں وہ انھیں مندرجہ بالا پتے پر ارسال فرما کر تعاون فرمائیں۔ کتاب کی اشاعت کے بعد خطوط اور تصاویر شکریے کے ساتھ واپس کر دی جائیں گی۔

مولانا صلاح الدین کے مضامین کا مجموعہ

لاہور، ادارہ ادبی دنیا لاہور نے "تصورات اقبال" کے عنوان سے ایک کتاب ترتیب دی ہے جو مولانا صلاح الدین احمد مرحوم کے مضامین پر مشتمل ہے۔ مولانا نے یہ مضامین علامہ اقبال کے فلسفے پر لکھے تھے۔ اور اب تک انھیں کتابی صورت میں شایع نہیں کیا گیا تھا۔ کتاب کو مولانا کے صاحبزادے نے ترتیب دیا ہے اور یہ اس ادارہ کے مطبوعاتی منصوبہ کے تحت پہلی کتاب ہے۔

پنجابی یونیورسٹی کا ایک مستحسن فیصلہ

چنڈی گڑھ۔ پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کی سینیٹ نے اپنے ایک اجلاس میں دیگر فیصلہ جات کے ساتھ اردو زبان کو ذریعۂ امتحان کے طور پر تسلیم کرنے کا قابل تحسین فیصلہ بھی کیا ہے۔ اس فیصلہ کے مطابق آئندہ طلبہ امتحانات میں جواب مضمون کے لیے اردو کو بھی استعمال کرنے کے مجاز ہوں گے۔ قبل ازیں پنجابی یونیورسٹی میں ذریعہ امتحان کے طور پر صرف پنجابی، ہندی اور انگریزی کے استعمال کی ہی اجازت تھی۔ اب ان میں اردو بھی شامل کر لی گئی ہے۔

اردو مراٹھی ڈکشنری شایع ہو گئی

بمبئی۔ ادب اور ثقافت کی ترویج و ترقی اور مراٹھی ادب میں ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے تراجم شایع کرنے کے لئے حکومت مہاراشٹر نے ایک بورڈ قائم کیا تھا۔ بورڈ کے چیرمین مسٹر کے منی شاستری جوشی نے ایک پریس کانفرنس میں بورڈ کی کارگذاری کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس کی طرف سے ایک اردو مراٹھی اور مراٹھی اردو ڈکشنری شایع کی گئی ہے اس کے علاوہ کنڑی، گجراتی اور بنگالی ڈکشنریاں بھی تیار کی گئی ہیں۔

نیشنل بک فیر

عروس البلاد بمبئی میں نیشنل بک ٹرسٹ نے کتابوں کے میلے کا اہتمام کیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ شاخ بمبئی نے بھی اس میلہ میں شرکت کی اور ایک "گوشۂ اردو" قائم کیا، نیشنل بک ٹرسٹ کی نمائش میں شعراء اور ادباء نے بھی اردو کے تعلق سے جامعہ اور کلچرل پروگرام میں خاصی دلچسپی لی۔

خواجہ غلام السیدین اور علی سردار جعفری کیلئے اعزاز

نئی دہلی۔ صدر جمہوریہ نے یوم جمہوریہ کے موقع پر چار اصحاب کو پدم بھوشن کا اعزاز دیا، پدم بھوشن پانے والوں میں مشہور ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین اور ملک راج آنند بھی شامل ہیں پدم بھوشن کا اعزاز جن لوگوں کو ملا ہے ان میں علی سردار جعفری بھی شامل ہیں۔

ماہنامہ "صبا" کا مخدوم نمبر

حیدرآباد کا ادبی جریدہ "صبا"، جشن مخدومؔ کے موقع پر اپنا ایک خصوصی نمبر پیش کرنے والا ہے جس میں مخدومؔ محی الدین کی ادبی و سماجی زندگی ان کی شخصیت اور فن کا جائزہ لیا جائے گا۔ اس ضخیم نمبر کی قیمت چار روپیہ ہے اس کے مرتب سلیمان اریب ہیں۔

دکنی رباعیاں

اردو کی ممتاز محقق اور صاحبِ طرز تنقید نگار ڈاکٹر سیدہ جعفر کی نئی کتاب "دکنی رباعیاں" کے نام سے آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی کی طرف سے شایع ہو چکی ہے۔

دہلی میں جشنِ فراق

دہلی۔ اردو کے ممتاز شاعر پروفیسر رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری کے اعزاز میں "جشن فراق" منایا گیا۔ جشن فراقؔ کروڑی مل کالج کے شعبۂ اردو کے اہتمام میں منایا گیا۔

فراقؔ کی شاعری، فن اور شخصیت پر ایک ذو سو (۲۰۰) صفحات کا صحیفہ فراقؔ کو خواجہ غلام السیدین نے پیش کیا۔ اس موقع پر ممتاز ادیبوں اور نقادوں نے "اردو شعر و ادب کے لیے فراقؔ کی خدمات" پر ایک مباحثہ میں حصہ لیا۔ فراقؔ صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں نے شاعری میں ہمیشہ "زندگی کی زبان" استعمال کی ہے اور شاید میری تھوڑی بہت شہرت کا راز یہی ہے۔